روزی کا سوال

واجدہ تبسم

شیشۂ دل

سے

واجدہ تبسّم

روزی کا سوال

بار اوّل ۱۹۷۷ء

تعداد ۱۰۰۰

قیمت دس [illegible] روپے

مطبوعہ اردو لیتھو پرنٹنگ ورکس شاہدرہ دہلی

کتابت نعیم اقبال شیرکوٹی

شیشۂ دل

آج کی رات دل پر کس قدر بھاری ہے !!

باہر زوردار بارش ہو رہی ہے ـــــ سرد اور کٹیلی، ہوائیں میری کوٹھی کے در و دیوار سے ٹکرا رہی ہیں۔ میں نے شیشے کے دریچے سے اپنی ناک لگا کر ابھی ماحول کی ٹھنڈک محسوس کی ہے ـــــ بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی ہے جیسے آج برس کر پھر کبھی نہ برسے گی ـــــ آج یوں محسوس کر رہی ہوں میں کہ یہ بوندیں، آسمان کے آنسو ہیں۔ شاید اسے بھی میرے غم پر رونا آ رہا ہے ـــــ

سائیں سائیں کرتی ہوا جب کمرے میں چکر لگاتی ہے تو، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہوا میرے حالِ تباہ پر سسکیاں بھر رہی ہے۔ آسمان پر بجلیاں بھی نہیں چمکتیں کہ زندگی کی تاریکی میں ذرا سی

روشنی کا احساس ہی دل کو خوش کر دے۔

آج تو ہر طرف تاریکی ہے، ہر سو اندھیرا ہے، ستاروں کی طرح روشنی بکھیرنے والے لمحات تو کب کے گذر چکے۔ آج تو صرف آنسو ہیں اور کراہیں ——— آج کی رات !!

آج سے پہلے میں کس قدر خوش تھی؟ کس درجہ مطمئن؟؟ دل کے نہاں خانوں میں چھپے غم کون دیکھ سکتا ہے بھلا ———؟ میں نے اپنے غموں پر خوشیوں اور مسکراہٹوں کا رنگین پردہ ڈال رکھا تھا، جو اتنا دبیز تھا کہ غم کی کرنیں کبھی اس کے آر پار نہ چمک سکیں، اور دیکھنے والوں نے یہی سمجھا کہ مجھ سا خوش بخت اس دنیا میں کوئی نہیں میں نے خود اپنے آپ کو اس قدر بھرپور دھوکا دیا تھا دوسروں کو دھوکے میں رکھنا کون سی مشکل بات تھی ———؟

لیکن آج سارے بھرم کھل گئے ہیں۔ آج دل کا ہر داغ نمایاں ہو گیا ہے ——— اور میں بے حد حیرت کے ساتھ سوچ رہی ہوں کیا کسی کے منہ سے نکلا ایک ننھا سا جملہ میری خوشیوں کو یوں پامال، کر سکتا ہے ———؟

میں نے ابھی نگاہیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا ہے آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے، سیاہ بادلوں کے اس پردے کے پیچھے ستارے بھی ہوں گے، بجلیاں بھی، لیکن سیاہی نے روشنی کو نگل لیا ہے، اب صرف رات کا بے پناہ اندھیرا ہے، بارش اسی شدت سے ہو رہی ہے میں چاہتی ہوں آج اتنی بارش ہو، اتنی بارش ہو کہ اس پانی میں سب کچھ ڈوب جائے ——— سب کچھ بہہ جائے ——— میں اپنے غم، اپنی

حسرتیں، اپنے دکھ، اپنا وجود تک بھول جاؤں، لیکن میں جانتی ہوں ایسا نہیں ہو گا۔

بارش بھی تھم جائے گی، چاند بھی چمک اٹھے گا، ستارے بھی نکل آئینگے، لیکن میں اپنے سدا بہار غم کو لئے لئے یادوں کے کھنڈر میں پھرتی رہوں گی۔ گلِ لالہ کے داغ کی طرح محبت کے اس داغ کو بھی ہمیشگی حاصل ہو گئی ہے۔

رات میرے ارمانوں کی طرح تاریک ہے۔

آج دوپہر ہی کی بات ہے خالد نے ایک پارٹی ارینج کی تھی، بہت سے مہمانوں کے ساتھ ساتھ اس نے آفتاب کو بھی اِن وائٹ کیا تھا خالد نے آج میرے لئے خاص طور سے ایک ساڑی خرید کی تھی ــــ ننھے ننھے گلاب کے بے شمار سُرخ سُرخ پھولوں اور ہری ہری کومل پتیوں والی سلکن ساری۔

اور یہ ساڑی پہن کر بقول خالد میں "جانِ بہار" نظر آ رہی تھی۔ واقعی خالد نے شادی کی پہلی سال گرہ کے عین مطابق بہاروں سے بھرا تحفہ دیا تھا۔ میں کس قدر خوش تھی !!

اور خوش کیسے نہ رہتی ایک عورت کی زندگی کی معراج اور کیا ہوتی ہے ــــ؟ محبت کرنے والا شوہر، گڑیا جیسی ننھی منی کلی، اور پھر جس کا ماضی غربت اور افلاس میں کٹا ہو اس کے لئے ذاتی بڑی سجی سجائی کوٹھی ــــ کار ــــ فون، ــــ یہ سب چیزیں بہت معنی رکھتی ہیں ــــ! مہمان ایک ایک کر کے آ رہے تھے۔ چھیڑ چھاڑ بھی ساتھ ہی ساتھ چل رہی تھی۔

ذکیہ نے خالد پر وار کیا۔

"بھئی شادی کی پہلی سال گرہ کی تصویر تو عموماً میاں بیوی پر مشتمل ہوتی ہے، مگر یہاں تو تیسرا ممبر بھی شامل ہوگیا ہے ——— بھئی بہت جلد باز ہو تم لوگ ———"

خالد بے شرمی سے ہنس دیا

"بھئی اپنا بس نہیں چلا ورنہ پروگرام میں تو یہ شامل تھا کہ بابا بے بی ساتھ ہی آجاتے ———"

سب نے قہقہے لگائے اور میں جھینپ کر رہ گئی۔

مہمان آتے گئے ——— تحفوں سے میز لدتی گئی ——— سب سے آخر میں آفتاب آیا ——— روایتی شہزادوں کی طرح خوبصورت وجیہہ اور بے پناہ گریس کا مالک ——— اس کے آتے ہی رمیش نے چوٹ کی

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

خالد ہنسکر بولا

"آفتاب کے سامنے چراغ جل بھی کہاں سکتے ہیں یار" پھر اس کی پیٹھ ٹھیک کر بولا ——— "کیوں طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟ بڑے بجھے بجھے سے نظر آرہے ہو ———؟"

آفتاب ہنس دیا ——— اداس دل والی ہنسی ——— "نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں ——— کام ——— کام ——— انسان مشین تو ہے نہیں کہ تھک نہ جائے"

"پھر ضرورت اس بات کی ہے فوراً شادی کر لی جائے"، اسلم چہکا "کیونکہ ہر مرض کی دوا ہے بیوی ــــــ"

ہنسی کا ایک فوارہ چھوٹا مگر آفتاب اس میں حصہ نہ لے سکا ــــــ میں نے سہم کر اس کی طرف دیکھا ــــــ اس کے روشن اور خوبصورت چہرے پہ تاریکی اور غم کا یہ کیسا سایہ لپکا ــــــ؟ خدا خیر کرے ــــــ تھوڑی دیر بعد جب وہ میز پہ اپنا تحفہ رکھ رہا تھا تو میں نے دھیرے سے کہا۔

"واقعی اب آپ کو شادی کر لینی چاہیئے"

اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ میرا وجود ڈگمگا اٹھا ــــــ

"شادی، کیوں ــــــ؟" ہلکی سی درد بھری مسکراہٹ!

"دل بہلنے کے لئے ــــــ اور کیوں ــــــ کیا لوگ شادیاں نہیں کیا کرتے؟"

"لیکن میں بار بار شادی کرنے کا قائل نہیں ہوں"

میں اس کے دیئے ہوئے شیشے کے گل دان کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی، اس کی بات سن کر چونکی ــــــ

"بار بار شادی ــــــ؟ تو کیا آپ نے شادی کی ہوئی ہے ــــــ؟"

وہ ہنسا اور بھرا اعتماد سے بھرپور لہجہ میں بولا ــــــ

"سنو سحر ــــــ میں نے زندگی میں صرف تم سے محبت کی، تمہیں چاہا اور تم سے ہی شادی کا خواب دیکھا، لیکن جب تم نے

کسی اور کا دامن تھام لیا تو میں نے سوچا مجھی میں کوئی خامی رہی ہو گی جو تم نے مجھے نظر انداز کر دیا ——!"

"چھن ——"

میرے ہاتھوں سے شیشے کا گلدان گرا، اور کرچی کرچی ہو گیا اور ہر کرچ جیسے میرے دل میں چبھ گئی وہ کہے جا رہا تھا ——

"میں نے جب دیکھا کہ تمہارے دل میں میرے لئے کوئی جذبہ نہیں تو تمہارے راستے سے ہٹ گیا۔ میں محبت میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں، میں کیوں تمہیں محبت کرنے پر مجبور کرتا ؟ لیکن یہ پھانس میرے دل میں کئی دنوں سے اٹک کر رہ گئی ہے کہ پوچھ تو لوں کہ کیا میں اتنا برا تھا ——؟؟"

میں نے گھبرا کر اسے دیکھا —— ادھر ادھر دیکھا —— سب باتوں میں مشغول تھے، قہقہے، مذاق، لطیفے —— ہر طرف خوشیوں کی بارش ہو رہی تھی، مگر میں ایسے میں کہاں تھی —؟

وہ سہم سا گیا —— معافی مانگنے کے انداز میں بولا ——

"خدا کے لئے سحر مجھے غلط نہ سمجھنا —— اور —— اور ——"

وہ رک کر بولا ——

"اب سے خدا کے لئے کبھی مجھے شادی کے لئے نہ کہنا میں بڑی تباہ زندگی گذار رہا ہوں ——" وہ یونہی کھڑے کھڑے میز کی سطح پر انگلی سے شعر لکھنے لگا ع

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ سانحہ تھا امیر
پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا

میں بت بنی کھڑی تھی ——— میری محویت کو سلمیٰ کی، آواز نے توڑا ———

"بھئی خالد صاحب ——— آپ نے سحر کے لئے ساڑی تو خوب پسند کی لیکن کچھ نامکمل سی ہے ———"

"کیا مطلب ——— ؟" خالد پریشان ہو کر پوچھ رہا تھا۔

"مطلب یہ کہ آپ کی پسند کردہ اس ساڑی میں پتیاں ہیں ڈنڈیاں ہیں، پھول ہیں سب کچھ ہے، مگر کانٹے نہیں ہیں حالانکہ پھول کے ساتھ کانٹے تو ہونے ہی چاہئیں ———"

میں نے بڑے کرب سے سر اٹھا کر سلمیٰ کی طرف دیکھا

"کانٹے؟ ساڑی پھولوں سے لدی ہے تو کیا ہوا ——— کیا میری زندگی میں کانٹے نظر نہیں آرہے تمہیں ———" لیکن یہ آواز میرے دل سے نکلی تھی، ہونٹ تو بے صدا ہی تھے۔

——— مجھے یوں کھڑے کتنے زمانے گذرے مجھے پتہ نہیں ——— جب میں نے چلنے کے لئے قدم اٹھایا تو آفتاب کہہ رہا تھا ———!

"سنبھل کے سحر ——— راہوں میں شیشے کی کرچیاں ہیں، کہیں پاؤں میں نہ چبھ جائیں،"

میں نے بے بس ہو کر اسے دیکھا ——— "تم پاؤں کی بات کرتے ہو اور یہاں تو دل لہولہان ہے ———" میں پھر بھی خاموش ہی تھی ———

اندر ——— "فش پونڈ" والا مخصوص گیم شروع ہو چکا تھا۔

چلانے اودھم مچانے کی آوازیں کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں، کسی نے ہمیں آواز دی ——— "بھئی دو مچھلیاں غائب ہیں، انہیں پکڑ لاؤ نا ———"

لیکن میں اندر جانے کی بجائے بیڈ روم میں چلی آئی ——— زور سے آنکھیں میچ کر سونے کی کوشش کی، لیکن خوشیوں کی طرح نیند بھی جا چکی تھی۔ ذہن کے آسمان پر یادوں کے ستارے ایک ایک کر کے ٹوٹتے رہے۔ ہر جانا پہچانا چہرہ چاند بن کر ابھرتا ڈوبتا رہا۔ سب سے آخر میں صرف ایک ہی چہرہ چمکتا رہ گیا ——— یہ آفتاب تھا ——— !!

وہ لمحہ جب میں نے پہلی بار دل کے سارے جذبوں کے ساتھ، آفتاب سے محبت محسوس کی ——— !

شبنم باجی کی شادی تھی۔ ہمارا گھر بیحد چھوٹا اور شکستہ سا تھا اس لئے اُن کی شادی پھوپی اماں کی شاندار کوٹھی میں ہونی طے پائی۔ پہلی بات تو بہن کی جدائی کا احساس اور دوسری بات اپنی غریبی کا احساس۔ یوں لگ رہا تھا کہ دل کا شیشہ کرچیاں کرچیاں ہوا جا رہا ہے، اے کاش ابّو زندہ ہوتے، ہم بھی صاحبِ حیثیت ہوتے لاکھ سگی پھوپی سہی، پھر بھی باجی کی شادی کسی اور کے ہاں نہ ہو کر اپنے بنگلے میں ہوتی ———

زندگی نے کس قدر خوبصورت اور پر بہار دن دیکھے تھے آج کس قدر بے بسی کا سامنا تھا ——— ؟ امی کس قدر تباہ ہو رہی تھیں ——— ؟ میرا دل اندر ہی اندر رونے لگا ——— شا

کے سات آٹھ بجے کا وقت تھا۔ اندر باجی کی رخصتی کی تیاریاں ہو رہی تھیں کئی لڑکیوں نے مل کر باجی کو سنوارنا شروع کر دیا تھا باجی کی سسکیاں تھیں کہ رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں کئی، برسوں سے جو بندھن بندھا تھا۔ وہ اب ٹوٹنے جا رہا تھا، نئی زندگی میں قدم رکھتے ہوئے انہیں کس قدر خدشے ستا رہے ہوں گے۔ جانے اس راہ میں کیسے کیسے ساتھیں ملیں۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھیں گی بھی تو سوائے آنسوؤں اور کراہوں کے کیا ملے گا ؟ کیا ایک لڑکی کا مقدر یہی ہوتا ہے خدایا، کہ ہر گام پر ہر موڑ پر سہم سہم کر یہ سوچے کہ زندگی میں جس اجنبی ساتھی کا ہاتھ تھاما ہے، وہ اسے خوش بھی رکھے گا یا نہیں ؟

کیا محرومیاں ہی اس کا نصیبہ ہیں یا پلکوں سے ٹوٹ کر گرنے والے ہر آنسو، ہر موتی کو اس کا پردیسی ساتھی اپنی آنکھوں میں سمیٹ لینے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے !

میرے ٹوٹے دل نے دعا دی

" خداوندا باجی نے بڑے برے دن گذارے ہیں۔ ان کی راہ کا ہر کانٹا پھول بن جائے، ان کی ہر کراہ، ہر آنسو ہر غم کا بدلہ اب یوں دینا کہ وہ پھولوں، خوشیوں اور بہاروں میں کھو کر رہ جائیں "

[با]جی وداع ہو رہی تھیں۔ اس وقت مجھے ان کے پاس ہونا چاہا تھا۔ مگر میں وہاں باغ کے ایک کونے میں سنگِ مرمر کی کے ایک کونے پر سر نیہوڑائے یوں بیٹھی تھی جیسے کوئی

مجسمہ، آنسو میری آنکھوں سے رواں تھے ———

اندر سے سسکیوں اور چیخوں کی آوازیں بلند ہوتی سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے خود پر قابو رکھنا دشوار ہوگیا۔ اسی لمحہ میں نے اپنے سر پر کسی شفیق، مہربان اور محبت بھرے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا ———

"اس وقت تنہا بیٹھی یہاں کیا کر رہی ہو ——؟ ارے تم تو رو رہی ہو —— خدا خیر کرے —— کیا ہوا ——؟"

یہ آفتاب تھا —— میں نے کوئی جواب نہیں دیا —— بس سسکیاں اور تیز ہوگئیں ———

"افوہ —— یہ لڑکیاں بھی رونے میں خوب ماہر ہوتی ہیں بھئی ہوا کیا۔ یہی نا کہ باجی کی شادی ہوگئی۔ انہیں دولہا مل گیا اور مجھے نہیں ملا —— تو یہ ایسی کوئی رونے کی بات نہیں۔ اگلے سال تمہاری باری سہی ———

مجھے ہنسی آگئی، میں نے سر اٹھا کر دیکھا —— آفتاب نے بھی مجھے ایک لمحہ کو دیکھا اور مسکرا کر کہا ———

" بھئی برا نہ ماننا سحر اس وقت تمہاری آنکھوں میں آنسو اور ساتھ ہی ہونٹوں پر ہنسی دیکھ کر اچانک ایک شعر یاد آگیا۔

آتے ہی اُن کے، اشک ہمارے نکل پڑے
لو ساتھ ساتھ چاند ستارے نکل پڑے

میں نے آفتاب کی اس انتہائی بے باکی پر بڑی حیرت سے دیکھا وہ مسکرایا ———

"بھئی میں نے یہ اپنے لئے نہیں کہا ـــــ میں چاند واند نہیں ہوں بس معمولی سا آفتاب ہوں ـــــ"

"معمولی سا آفتاب ـــــ ؟؟" دل نے سوچا ـــــ "یہ معمولی سا آفتاب اگر میرے اندھیرے آسمان پر چمک اٹھے تو ـــــ ؟" میں سہم گئی، دل نے مجھے جگایا ـــــ "سحر ایسی انہونی خواہش نہیں، کیا کرتے ـــــ"، غم کے سیاہ بادل نے پھر مجھے اپنے سائے میں کھینچ لیا، میرا شگفتہ چہرہ جو ابھی ابھی سچ مچ پھول کی طرح کھل رہا تھا کھنچ سا گیا ـــــ یکدم بہت سارے آنسو میری آنکھوں سے ابل پڑے۔ ساتھ ہی ایک ہلکی سی چیخ بھی میرے منہ سے نکل گئی آفتاب نے ذرا آگے بڑھ کر میرا آنسوؤں سے بھرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بھاری آواز میں کہنے لگا ـــــ

"سحر میں تمہارے غم کو سمجھتا ہوں۔ اس وقت تمہیں شبنم کی جدائی کا اتنا خیال نہیں ہے جتنا اس بات کا کہ اس نے، اور ساتھ ہی تم نے بھی، کس قدر دکھی زندگی گذاری ہے، تمہارے دل میں یہ غم پل رہا ہے کہ ساری زندگی کٹھنائیوں میں گذارنے کے بعد آج جس کا ہاتھ تھاما ہے پتہ نہیں وہ کس انداز سے پیش آئے ـــــ اور زندگی اب اپنے آپ کو کس روپ میں پیش کرے ـــــ!

مگر سحر سب سے تڑاکر لے جانے والا اتنا بے رحم نہیں ہوتا، دراصل اسی ایک ہستی کے سہارے تو لڑکی اتنی ساری جدائیوں کو قبول کر لیتی ہے ـــــ رضوان میرا دوست ہے، میں اسے

جانتا ہوں ـــــــ"

اور تم نے بھی دیکھا ہے کہ وہ شبنم کو کس چاہت سے بیاہ کر لے جا رہا ہے ایسے بے بنیاد وسوسوں کو اپنے دل میں جگہ نہ دو" اس نے دھیرے سے میرا چہرہ چھوڑ دیا ـــــــ "یہ پیاری پیاری آنکھیں رونے کے لئے نہیں بنی ہیں ـــــــ"

میرا دل ڈگمگا گیا ـــــــ آفتاب کی تسلی میں کس قدر اعتماد بھرا ہوا تھا، جی چاہا اِک گناہ کر بیٹھوں کہ آفتاب کے آگے سر جھکا دوں ـــــــ جی چاہا اس کے پاؤں تلے کی دھول اپنی، مانگ میں بھر لوں، جی چاہا اک شکایت کر بیٹھوں کہ سورج کا ایک روپ ہونے کے باوجود بھی اب تک تم نے میری دنیا کو کیوں اندھیرا کر رکھا ـــــــ

لیکن میں کچھ نہ کر سکی، میں نے اپنا بوجھل سر اٹھایا وہ مجھ سے کس قدر بلند تھا جیسے وہ آسمان تھا، اور میں زمین ـــــــ مگر محبت جو کہ ان وسوسوں سے بالا تر ہوتی ہے میرے دل میں گھر کر چکی تھی ـــــــ

محبت میں سوچنے سمجھنے کی گنجائش ہوا کرتی تو میں آفتاب کو چاہنے سے قبل یقیناً یہ سوچ لیتی کہ وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اور اس کے ڈیڈی لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔ وہ بڑی سی کوٹھی میں رہتا ہے، لمبی سی کاریں گھومتا ہے اور میں ؟ مگر محبت واقعی اندھی ہوتی ہے ـــــــ!! اس رات کی چھوٹی سی

واردات کے بعد میں نے محبت کو اپنا جیون بنالیا۔ میں آفتاب کے لئے جینے لگی۔ ایک لمحہ کو بھی یہ نہ سوچا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ کیا وہ بھی مجھے چاہتا ہے ——؟ میں کیوں سوچتی، میرا مذہب محبت کئے جانا تھا۔ یہ سوچنے کی مجھے ضرورت نہ تھی کہ وہ مجھے چاہتا ہے یا نہیں —— چاہے گا یا نہیں —— میں محبّت میں سودے بازی کو کیوں جگہ دیتی۔ دل تو دینے کی چیز تھی دے دی لینے کے بارے میں میں نے کبھی نہ سوچا ——

لیکن زندگی ——! زندگی نے مجھے بتادیا کہ میں نے آفتاب کے ہاتھوں میں اپنا دل صرف جلنے کے لئے دیا تھا۔ اس نے میری محبت کو کبھی محبت نہ سمجھا ——؟؟

کیا وہ یہ سمجھتا رہا کہ یہ سب کچھ کھیل ہے ——؟؟

بھول شاید میری ہی تھی کہ اس کی تسلّی اور دلاسے کو محبت کا روپ دے بیٹھی۔ یہ تو سوچا ہوتا کہ غم اور دُکھ میں لوگ زخمی دل پر دقتی پیار کا پھاہا تو رکھ ہی دیتے ہیں —— مگر پھر اس چاہت کے نرالے ڈھنگ ——؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ عید پر پھوپھی اماں نے ہم سبھوں کو اپنے گھر بلایا تھا۔ عید کے ہنگامے کے بعد جب دوسرے دن ہم لوگ جانے لگے تھے تو پھوپھی اماں نے امّی سے کہا تھا ——

"ثریّا —— آفتاب نے کہا تھا سحر کو چند دنوں کے لئے، روک لینا"۔

امّی نے بڑبڑا کر مجھے دیکھا۔ میں نے پھوپھی اماں کو —— وہ

ہنس کر بولیں ۔۔۔۔

"وہ کہتا تھا شبنم کی جدائی سے سحر بہت نڈھال ہے اور خود کو تنہا تنہا محسوس کرتی ہے یہاں رہ کر اس کا دل بہل جائے گا"

۔۔۔ میرا من کھل اٹھا ۔۔۔۔ آفتاب کو میرا کس قدر خیال ہے کیا ۔۔۔ کیا ۔۔۔۔ میں نے رک رک کر، ڈر ڈر کر، سہم سہم کر سوچا ۔۔۔ "کیا وہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگا ہے ۔۔۔۔ ؟؟

مگر پھر وہی نامراد دولت دیوار بن کر کھڑی ہو گئی اور میں نے خود کو تسلی دی ۔۔۔ "وہ نہیں چاہتا تو کیا ہوا ۔۔۔ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں ہی اسے چاہتی رہوں ۔۔۔!"

پھوپھی اماں کے ہاں زندگی کا بالکل وہی ڈھب تھا، جو ناولوں افسانوں یا پکچروں میں ہوتا ہے۔ غم زندگی سے دور دور یہ لوگ خوشیوں میں اس طرح ڈوبے رہتے تھے کہ پتہ چلتا ہی نہ تھا کہ اس کوٹھی سے باہر، دنیا میں فکریں، الجھنیں، غم اور آنسو بھی ہوتے ہیں ۔۔۔۔

پھوپھی اماں کی ایک ہی لڑکی تھی رعنا باجی ۔۔۔۔ ایک ہی لڑکا آفتاب ۔۔۔۔ مگر اُن دونوں کے دوست احباب، ملنے جلنے والے اس قدر بے حساب تھے کہ بلا مبالغہ کوٹھی پر کسی ہوٹل کا گمان ہوتا تھا ۔۔۔۔ لوگ آرہے ہیں، جارہے ہیں، کافی چل رہی ہے، چائے بن رہی ہے، کھانے پک رہے ہیں، کھلائے جارہے ہیں، ریڈیو چیخ رہا ہے، پیانو کی خبر لی جارہی ہے، پنگ پانگ بیڈمنٹن، کرکٹ چل رہا ہے، کیرم کی شامت آرہی ہے، ساتھ ساتھ بھنے ہوئے ٹھنڈے پھل کھائے جارہے ہیں، ریڈیوگرام

پر مغربی موسیقی کے ایک ساتھ کئی کئی ریکارڈ چڑھا دیئے گئے ہیں، فلیش بلب چمک رہے ہیں۔ دھڑا دھڑ تصویریں کھینچی جا رہی ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب عجیب سا لگتا جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں یا پریوں کے قصوں والے دیس میں آنکلی ہوں، جہاں ہر طرف خوشیاں ہیں بہاریں ہیں، رنگین ریشمی چمکیلے بھڑکیلے ملبوسات ہیں، سب کچھ ہے مگر دل نہیں، محبت کی قدریں نہیں ——

وہ چوٹ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اس دن لمبی سی کار میں لد کر سب سینما جا رہے تھے۔ حسبِ معمول میں اکیلی باغ کے کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اکیلے پن میں خیالات میں کھوئے رہنا، میرا سب سے بڑا عیش رہا ہے۔ میں خیالات سے تب چونکی جبکہ کسی نے میرے متعلق بات کی ——

"ارے بھئی جب سبھی جا رہے ہیں تو سحر کو کیوں چھوڑ رہے ہو —— ؟"

رعنا باجی کی آواز آئی —— "بھئی اس کے کپڑے وغیرہ تو دیکھو، اور پھر بال بنانے کا تو اُسے ذرا سلیقہ نہیں — بئے کا گھونسلہ بنے رہتے ہیں اس کے بال ——"

رعنا باجی کی گہری سہیلی شیلا کی آواز آئی —— "مگر سچ پوچھو تو رعنا اس حلیئے میں بھی وہ پری جیسی لگتی ہے —— کیسا بے پناہ حسن پایا ہے کم بخت نے"

"اونہہ —— بھئی چلئے نا بہت دیر ہو جائے گی ——"

میں نے دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سمیٹا، قدرے سامنے

جھک کر کار کی طرف دیکھا۔ اسٹرنگ پر آفتاب جھکا ہوا تھا، رعنا باجی کا حکم پاکر وہ مستعد ہو گیا اور زوں کی آواز کے ساتھ کار یہ جا وہ جا ——!

مجھے آنسو روکنا دو بھر ہو گیا، امی مجھے یہاں کس لئے چھوڑ گئی ہیں ——؟ یوں کہیں دل بہلا کرتا ہے ——؟؟ میں اس قدر روئی ہوں اس قدر روئی ہوں کہ میری آنکھیں سرخ ہو گئیں اسی لمحہ مجھے اپنے سر پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا ——

یہ ہاتھ! اسے تو میں جنم جنم سے جانتی ہوں —— اسی ہاتھ کو تھام کر تو میں نے زندگی کے خواب زاروں میں قدم رکھا تھا، اسی ہاتھ کے سہارے تو چل کر میں نے بہاروں کے دروازے پر دستک دی تھی —— آفتاب یہ تمہارا ہی تو ہاتھ ہے نا میرے آفتاب مگر ——!

میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی —— آفتاب نے مجھے شرارت سے دیکھا ——

"تم تو بس اس موقعہ کی تاک ہی میں رہتی ہو کہ آنسو بہا سکو! چہرہ دیکھو ذرا سرخ گلاب ہو رہا ہے ——"

میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی —— "آپ کیوں پلٹ آئے ——؟"

میں نے نگاہوں سے سوال کیا —— میرے خاموش سوال کا اس نے بشاشت سے جواب دیا —— "ٹکٹ نہیں ملی" وہ ہنسا —— میں نے غیر یقینی انداز سے اسے دیکھا ——

ـــــ وہ مسکرائے جا رہا تھا۔

میرے خدا ـــــ میں کدھر جا رہی ہوں ـــــ یہ سب کیا ہو رہا ہے ـــــ کہیں محبت دھیرے دھیرے ہم دونوں کے دلوں میں اپنے قدم تو نہیں جما رہی ہے ـــــ

آفتاب ! خدا کے لئے آفتاب اس قدر قریب نہ آؤ ـــــ تمہاری قربت کا تصور ہی مجھے جلا کر رکھ دے گا ـــــ تم سورج ہو سورج کی تمنا خوبصورت سہی مگر زندگی مجھ پر اتنی مہربان نہیں کہ اُجالے میرا مقدر بن جائیں ـــــ !!

آفتاب نے کبھی بھولے بسرے بھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا میں کبھی یہ جان ہی نہ پائی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے یا محض ہمدردی ہے۔ بالکل ویسی ہی ہمدردی جیسی غریبوں کے ساتھ امیروں کو، پیسہ والوں کو ہوتی ہے۔ کبھی کبھار اس کے رویّے سے مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ مجھ پر نچھاور ہونے سے بھی دریغ نہ کرے گا ـــــ

لیکن جب میں اس جذبے کا تجزیہ کرنے بیٹھتی تو مجھے لگتا کہ وہ سب کچھ خدا ترسی اور ہمدردی ہے، وہی دل پر مرہم رکھنے کا پرانا انداز جس سے میں کبھی اس کی محبت کا ثبوت نہ پا سکی۔ ـــــ

پھوپی اماں کے ہاں ایک دن سب لوگ "میوزیکل چیرز" کھیل رہے تھے۔ یہ گیم یوں کھیلا جاتا تھا کہ اس میں بارہ کھلاڑی ہوتے تھے اور گیارہ کرسیاں۔ ـــــ

یہ گیارہ کرسیاں ایک قطار میں یوں رکھ دی جاتیں کہ ان کی سمتیں مخالف ہوتیں، ادھر کوئی بھی ہارمونیم بجاتا رہتا

اور بارہ کھلاڑی دھیرے دھیرے گیارہ کرسیوں کے ارد گرد گھومتے، بھاگتے رہتے۔ جب ہارمونیم رک جاتا تو اک دم سب کرسیوں کی طرف لپکتے جو ایک بچ جاتا وہ آؤٹ قرار دیا جاتا۔ اسطرح ایک کرسی اور ہٹا دی جاتی اور یوں آخر میں کرسی پا لینے والا جیت جاتا اور انعام کا مستحق ٹھہرتا

—— اس دن میں بھی اس گیم میں شامل کی گئی —— کرسیاں کم ہوتے ہوتے اور ساتھی آؤٹ ہوتے ہوتے آخر میں صرف میں اور آفتاب ہی رہ گئے ——

—— میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ ہارمونیم رکا تو حالانکہ آفتاب کرسی کے سامنے تھا مگر وہ ہٹ گیا اور مجبوراً مجھے بیٹھنا اور جیتنا پڑا۔ سب لوگ تالیاں بجانے اور شور مچانے لگے۔ لیکن رعنا باجی آگے بڑھیں اور زناٹے کے ساتھ بولیں ——

"ایسی بچھوری حرکتوں سے تم کیا سمجھتی ہو کہ پیار کی بازی بھی جیت لوگی —— ؟ اس بھرے میں نہ رہو، زمین بن کر آسمان کو چھونے کی کوشش مت کرو —— بھیّا تمہارے مقابل بہت عظیم ہیں اور یہ سوچ لو کہ وہ منگنی شدہ بھی ہیں ——"

—— میں کچھ بھی نہ کہہ سکی، سوچ بھی نہ سکی، ہوا کیا تھا ؟ رعنا باجی مجھ سے کیوں بگڑ بیٹھیں۔ میں نے کب ان کے بھیّا کو ان سے چھیننے کی کوشش کی ہے۔ میں کب اس گھر میں، اس محل میں، اس کوٹھی میں بہو بن کر آنا چاہتی ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں چاہتی، کچھ بھی نہیں چاہا، ہاں ایک چھوٹی سی بھول ہو گئی ہے کہ میں نے نہیں چاہا ہے۔ آفتاب —— اور بس ! ——

اُسی شام میں اپنے گھر چلی آئی اس تہیّے کے ساتھ کہ اب زندگی باقی رہی تو پھر کبھی اس کوٹھی میں قدم نہ رکھوں گی جہاں چراغوں کی بجائے دل جلائے جاتے ہیں. جہاں کے باغوں کے پھولوں میں خون دل کی لالی مسکراتی ہے، میں کبھی نہ جاؤں گی ——

مگر میرے سارے جتن دھرے کے دھرے رہ گئے جب ایک شام بیحد لمبی خوبصورت اور چکنی سی کار لے کر آفتاب آیا، اور امّی سے کہا کہ سحر کو امّی نے فوراً بلایا ہے —— امّی بیچاری کو کیا معلوم کہ تہہ میں کیا بات ہے. انہوں نے مجھے سوار کرا دیا کار کے چلتے ہی میرے آنسو بھی شروع ہو گئے، آفتاب نے ذرا دور چل کر کار روک دی ——

"اُفوہ —— پھر وہی ابرِ باراں ——!!"

وہ جیسے حکم دیئے جانے والے لہجہ میں بولا

"یہاں سامنے تشریف لے آیئے آپ ——" میں جھجکی تو وہ چڑ کر بولا —— "میں کہتا ہوں کہ سامنے آکر بیٹھو نا ——" میں دھیرے سے سامنے آکر بیٹھ گئی اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بولا —— "امّی ومی نے نہیں بلایا، میں خود ہی لینے آیا ہوں ——"

میں نے بوکھلا کر اسے دیکھا تو وہ ہنسا —— "چلو ایک لمبی ڈرائیو پر چلتے ہیں —— تمہاری ساری تھکن دور ہو جائے گی، تم جی اٹھو گی ——"

آفتاب —— تمہاری قربت میں اگر میں ہوں تو مجھے کون

سی تسکین زیر کر سکتی ہے ـــــ میں تو تمہیں دیکھتے ہی جی اٹھتی ہوں ، مجھے کسی سیر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے . وہ شئے جو خون بن کر میری رگوں میں دوڑ رہی ہے ، وہ تمہاری محبت ہے . بس اس دولت کو مجھے بخش دو پھر میں کبھی خدا سے اپنے بخت کی نارسائی کا گلہ نہ کروں گی ـــــ

مجھے صرف تمہارا ساتھ چاہیئے میرے آفتاب ! یہ سب کچھ میرے دل کی زبان نے کہا ـــــ میرے ہونٹ ساکت و صامت تھے اور آنکھیں ـــــ ؟ (ان آنکھوں نے ہی تو مجھے تباہ کیا ـــــ نہ یہ ہوتیں نہ میں آفتاب کا جلوہ دیکھتی اور تباہ ، ہوتی ـــــ !) وہ آفتاب کو یوں دیکھے جا رہی تھیں کہ بس چلے تو سدا کے لیے ڈھیں چھپا کر رکھ لیں ـــــ

وہ رات ـــــ زندگی کی یادگار رات ـــــ رعنا باجی اور آفتاب کے بہت سے دوست ، احباب اور لکھنؤ والی ممانی جان کے سارے بچے مل کر باغ میں بیٹھے ہوئے تھے ، بات یوں نکلی کہ مردوں کو کس قسم کی . بیویاں پسند کرنی چاہیئں اور بیویاں کس قسم کے مردوں کو پسند ، کریں ـــــ ایک صاحب بولے ـــــ "کیوں یار آفتاب تمہارا کیا نظریہ ہے اس کے متعلق ـــــ" آفتاب نے بے پناہ سنجیدگی سے جواب دیا ـــــ "یار بیوی کے متعلق اپنا ایک ہی نظریہ ہے کہ بیحد اچھے اچھے بالوں والی ہو اور بیحد صاف ستھری نہ ہو ـــــ اس سے یہ ہوتا ہے کہ شام کو جب تھک تھکا کر گھر آؤ تو یہ احساس بڑا سکون دیتا ہے کہ بیوی بڑی سگھڑ

اور خانہ دار قسم کی ہے۔ دن بھر کے کام سے بال الجھ گئے ہیں ــــــ رنگ سنولا گیا ہے، کپڑے ذرا میلے ہو گئے ہیں ــــــ وہ ہنس کر ذرا رکا اور رعنا باجی کی طرف دیکھ کر بولا "ہر دم ہی ہی ہا ہا کرنے بن ٹھن کر سدا بیٹھی رہنے والی خواتین کو میں اک دم ڈس لائک کرتا ہوں ــــــ"

یوں جیسے سارا قصور میرا ہی تھا، رعنا باجی نے مجھے بیحد گھور کر دیکھا اور جل کر آفتاب سے مخاطب ہوئیں ــــــ" مگر بھیا صاحب آپ کو مبارک ہو کہ آپ کی ہونے والی دلہن ان تمام صفات سے مبرا ہیں جو آپ کو پسند نہیں ــــــ شاہینہ بیحد صاف ستھری رہتی ہیں، بال بڑے سجے سنورے رہتے ہیں اور خدا کے کرم سے اس کے ہاں اتنے نوکر ہیں کہ اسے بیل کی طرح کام میں جت کر کپڑے میلے کرنے کی بھی ضرورت نہیں پیش آتی ــــــ"

میں نے پہلی بار آفتاب کو اتنے غصہ میں دیکھا ــــــ "رعنا خاموش رہو ورنہ زبان کھینچ لوں گا ــــــ نالائق کہیں کی ــــــ"

ــــــ ماحول اچانک بڑا ٹینسنلس ہو گیا۔ کچھ سوچ کر آفتاب نے خاموشی اختیار کر لی ــــــ رعنا باجی اپنی انسلٹ بری طرح فیل کر کے بالکل بچوں کی طرح روتی ہوئی اٹھ گئیں ــــــ " بڑے آئے مجھے ڈانٹنے والے ــــــ سب کچھ ڈیڈی سے نہ کہہ دیا تو نام نہیں، بڑے آئے شادی کرنے والے ــــــ"، انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں ــــــ

پھر سب اٹھ گئے میں اکیلی بیٹھی رہ گئی ــــــ خزاں رسیدہ

پتے ایک ایک کر کے ٹوٹتے اور میرے قدموں میں آ آ کر ڈھیر ہوتے رہے ـــــــ

اس ڈھیر میں بیٹھے بیٹھے اچانک میں نے یوں محسوس کیا کہ میں خود بھی ایک خزاں رسیدہ پتہ ہوں جو خزاں کے بے رحم، ہاتھوں یہاں ٹوٹ کر آ گرا ہے ـــــــ بڑی رات گئے میں ڈھیرے سے اٹھی ـــــــ باغ میں موسم اور بے موسم کے جتنے بھی زرد رنگ کے پھول تھے سب کو جمع کیا اور ایک گلدستے کی شکل میں جمع کر کے آفتاب کی میز پر رکھ آئی ـــــــ

دوسرے دن ایک عجیب و غریب حادثہ ہو گیا ـــــــ رعنا باجی کو دیکھنے لئے کچھ مہمان آنے والے تھے ـــــــ ویسے تو بڑے باپ کی بیٹی ہونے کے باعث انہیں کئی پیغام آ چکے تھے ـــــــ ان میں ایسے بھی تھے جو مالا مال تھے، ایسے بھی تھے جنہیں امیر گھرانے کی بیٹی کے ساتھ ساتھ ہزاروں روپے کے جہیز کی بھی آس تھی ـــــــ

مگر یہ جو مہمان آ رہے تھے یہ اس قدر رئیس تھے کہ ان کے بارے میں سنا گیا کہ وہ کہتے تھے کہ " آسمان خدا کا زمین میری ـــــــ"۔ یعنی چاند سورج ستارے اور آسمان ہی ایسی چیزیں ہیں جنہیں میں حاصل نہیں کر سکتا، ورنہ زمین پر شاید ہی کوئی شے ایسی ہو جسے میں چاہوں اور نہ خرید لوں ـــــ!

پھوپا صاحب ایسے کوئی پرانے خیال کے آدمی نہ تھے، رعنا باجی بھی پردہ نہیں کرتی تھیں، خود ہی کار ڈرائیو کرتی تھیں شاپنگ کو کھلی کاریں جاتی تھیں ــــــ اُن پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی ــــــ

اکلوتی تھیں، ماں باپ کے بےحد لاڈوں کی تھیں، خالد صاحب اپنا پیغام خود ہی لے کر آ رہے تھے کیونکہ ان کے ماں باپ عرصہ ہوئے انتقال کر چکے تھے، ٹی پارٹی کا بےحد بڑے پیمانے پر انتظام ہوا تھا، اس کی کرتا دھرتا رعنا باجی ہی تھیں ــــ

شام بڑے خالد صاحب آئے، پارٹی انہوں نے خوب انجوائے کی اور سب میں بےحد گھل مل گئے۔ جاتے جاتے وہ بےحد خوش تھے، پھوپا صاحب سے انہوں نے بالکل فرینک ہو کر کہا ــــــ!

"آپ کے گھر کا ماحول مجھے بہت پسند آیا ــــ سب لوگ بھی سحر کو میں نے ہر لحاظ سے بہترین پایا ــــ مجھے بار بار فارن آنا جانا پڑتا ہے۔ جلد ہی پھر جانا ہے۔ بہت بہتر ہو تو آپ اس نیک کام کو جلد سے جلد نبٹا دیں"

پھوپا صاحب نے بےحد اطمینان سے جواب دیا "جیسی آپ کی مرضی"

اس رات جب میں نیند کے لئے تڑپ رہی تھی اور نیند مجھ سے بھاگی جا رہی تھی، آنسوؤں کی سوغات دے کر ــــ کہ پھوپا صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور بےحد پیار سے بولے

"بیٹی سحر آج کل کا زمانہ ایسا نہیں ہے کہ شادی بیاہ جیسے مسئلے میں لڑکیوں کی رائے نہ پوچھی جائے ـــــ خالد نے رعنا کی بجائے تمہیں پسند کیا ہے ـــــ ٹھیک ہے، تم بھی میری ہی بیٹی ہو. اور اس لحاظ سے زیادہ توجہ اور محبت کی مستحق کہ تمہارے سر پر باپ کا سایہ نہیں، بیٹی خالد کو میں رعنا کے لئے ہر لحاظ سے پسند کر چکا تھا صرف خالد کی اپنی پسند باقی رہ گئی تھی سو اس نے آج تمہیں پسند کر لیا ـــــ ظاہر ہے مجھے یہ رشتہ دل سے پسند ہے، تمہاری ماں کو بھی ہوگا ہی ـــــ تم اپنی رائے بتلا دو ـــــ

مگر میں اپنے طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے اچھا رشتہ تمہیں پھر کبھی نہ آئے گا، سوچو اور مجھے جواب دو وقت بڑا قاتل ہے وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا ـــــ ایسا نہ ہو کہ بعد کو تم پچھتاتی رہو ـــــ"

" لیکن پھوپا صاحب میں آفتاب کو چاہتی ہوں، میں اس کے بغیر زندگی کا تصوّر تک نہیں کر سکتی. پوچھنا کیا ضرور ہے کیا آپ کو محسوس نہیں ہوتا کہ میرا انگ انگ اُس کا دیوانہ ہے. ـــــ خدا کے لئے پھوپا صاحب رعنا باجی کو خالد صاحب سے بیاہ دیجئے اور مجھے بہو بنا کر اپنے قدموں میں جگہ دے دیجئے ـــــ"

میں نے بے صدا آواز سے چلاّ چلاّ کر یہ سب کچھ کہا، مگر پھوپا صاحب کچھ نہ سُن سکے ـــــ میں چکرا کر ان کے پیروں

میں گر پڑی اور وہ میری خاموشی کو رضا سمجھ بیٹھے۔

پھوپا صاحب نے باپ بن کر میری شادی کا سارا بار اٹھا لیا۔ دن رات میں یہی سوچتی رہتی اس محبت کے بوجھ کو میں کس طرح سہار پاؤں گی ____؟ کہیں خالد پر یہ راز افشا ہو گیا تو ____؟ آفتاب تم تو مرد تھے، تم نے یہ بزدلی کیسے دکھائی کیوں نہ اپنی امی اور ڈیڈی سے صاف کہہ پائے میں سحر سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔! سوچتے سوچتے مجھے ہنسی آ جاتی ____ مگر سحر بی بی ____ آفتاب نے تم سے محبت کا اقرار ہی کب کیا ہے جو تم ان زاویوں سے سوچتی ہو ____ اگر محبت ہوتی تو ضرور کہتا، مگر کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہیں چاہتا بھی ہے ____؟ یہی ایک غم تھا جس نے جان سی لے لی ____ اور یہی ایک سہارا تھا جس نے جینے کا حوصلہ بخشا کہ جب اس نے مجھے چاہا ہی نہیں تو میں کیوں اپنی محبت سے خالد کو محروم کروں ____؟

یہ سوچ کر میرا جی جل اٹھتا کہ میرے ہی لئے آفتاب کے دل میں ہمدردی اور خدا ترسی کا جذبہ کیوں ابھرا جسے میں نادان محبت سمجھ بیٹھی۔ اب کبھی آفتاب سے سامنا ہونے کی نوبت آتی تو میں نگاہیں چرا لیتی۔ عورت سب کچھ برداشت کر جاتی ہے، محبت کی تذلیل نہیں سہہ سکتی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ آفتاب پر اپنی بے لوث محبت کا راز کھول دوں اور وہ یہ سمجھنے لگے کہ میں اسے شاید اس لئے چاہتی ہوں کہ اس کے پاس دولت ہے، کوٹھی ہے، کار ہے، نہیں میری محبت اتنی سستی نہیں ہے ____ اے

خدا مجھے صبر کی طاقت دے، میں نے خود کو حالات کے ہاتھوں، سونپ دیا ——

خالد کے یہاں بیاہ کر آئی تو مجھ پر زندگی کے نئے دروازے کھل گئے۔ خالد نے دنیاوی عیش کے ساتھ ساتھ مجھے اس قدر بھر پور محبت دی کہ میں اپنے نصیب پر آپ نازاں ہو گئی، زندگی میں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی، کبھی بھولے سے میرا دل نہ دکھایا جو بات میرے منہ سے نکل گئی گویا پتھر کی لکیر ہو گئی اور اسے پورا کرنا خالد پر فرض ہو گیا ——

میرا دل جو آفتاب کی محبت میں جل کر راکھ ہو چکا تھا خالد کی محبت سے جی اٹھا، میں اپنا ماضی بھول گئی، سب کچھ بھول گئی، صرف یہ یاد رہ گیا کہ — میں خالد کی ہوں اور خالد میرا —— زندگی میں جتنی محرومیاں تھیں، کھونے کا جو کچھ احساس تھا، سب مٹ گیا، میں خوشیوں میں مگن ہو گئی، ہر بات بھول گئی ہر یاد کو فراموش کر دیا ——

زندگی کا تقاضا ہی یہ تھا کہ خالد کی بے پناہ محبت کا جواب محبت سے دے سکوں، آج آفتاب آ گیا اور اپنے ساتھ یادوں کی بے شمار کرچیاں بھی لے آیا، جو میرے دل میں چبھ کر رہ گئی ہیں —— اور اب جس سے زندگی بھر قطرہ قطرہ خون نچوڑتا رہے گا اور میں، ویران راتوں میں آنسوؤں کے چراغ جلائے دیئے سوچتی رہا۔

کردوں گی کہ یہ سب کیا ہو گیا ـــــ کیا ہو گیا ـــــ آفتاب نے پوچھا ہے ـــــ "مجھ میں کیا خامی تھی، کیا میں اتنا برا تھا کہ تم اپنا نہ سکیں ـــــ؟ میں محبت میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں، میں کیوں تمہیں محبت کرنے پر مجبور کرتا ـــــ تمہارے دل میں میرے لئے کوئی جذبہ ہی نہ تھا تو میں بھی تمہارے راستے سے ہٹ گیا ـــــ!

وہ میرا بے پناہ احساس کمتری خدایا ـــــ جس سے سدا میرے لب بند ہی رہے کسی لمحہ بھی آفتاب کے سامنے میں زبان نہ کھول سکی۔ ہر بار آنسوؤں سے بات کا جواب دیا، یا کبھی مسکرا کر رہ گئی ـــــ

یہ سوچا ہی نہیں کہ ہر بار کی خاموشی اسے غلط فہمی میں بھی مبتلا کر سکتی ہے۔ میری خامشی نے اسے غلط فہمی میں ڈالا کہ میں اسے نہیں چاہتی، اور اس کے یوں محتاط رہنے سے میں یہ سمجھی کہ وہ مجھ سے صرف ہمدردی جتا رہا ہے۔ یہ کیسی بھول ہو گئی خدایا ـــــ

لیکن اگر یہ غلط فہمیاں پیدا نہ ہوتیں تو بھی کیا میں آفتاب کو حاصل کر سکتی تھی ـــــ؟ آفتاب اتنی بڑی "ٹکر" لے سکتا تھا کہ اپنی منگنی توڑ کر مجھ سے شادی کر لے ـــــ!

پیسے کی طاقت بہت بڑی ہوتی ہے آفتاب ـــــ چلو یہی سوچ کر تم خوش رہو زندہ رہو کہ میں نے ہی تمہیں ٹھکرا دیا ہے۔ اگر میں تمہاری ہو جاتی، تب بھی ایسے

اذیت ناک ماحول میں شاید جی پاتی، جہاں رعنا باجی کے دل چیرنے والے طعنے سدا کانٹوں کی طرح دل کو چھیدتے رہتے۔ اب سوچتی ہوں کہ ان کی مجھ سے بے پناہ نفرت بھی ٹھیک ہی تو تھی آفتاب ـــــ بھلا کون بہن چاہے گی کہ اس کا بھائی ہیرے جواہرات کو چھوڑ کر کنکروں کو گلے لگالے۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کب سجا ہے؟ تمہاری کوٹھی میں رہ کر میں سدا احساسِ کمتری کے بوجھ تلے دبی رہتی، شاید ہی کبھی سر اٹھا کر جی پاتی میری خودی اور انا کی شکست کے گچوکے میرے دل کو گھائل کر چھوڑتے ـــــــــ

ـــ تم سوچو گے کہ دل بہلانے کو کیسی کیسی انوکھی باتیں بنا رہی ہوں، سوچو گے خالد کیا کم امیر ہے، پھر کیا اس کے ساتھ رہ کر، مجھے احساسِ کمتری نہیں ہوا ـــــ؟ نہیں آفتاب ـــ خالد کی بات اور ہے۔ میرے بچپن سے لے کر میری جوانی تک کا ہر لمحہ تم لوگوں کے سامنے رہا اور میں نے اور تم نے، اچھی طرح جانا ہے کہ تم لوگ ستارے ہو آسمان پہ چمکنے والے ـــــ میں دھول ہوں پیروں سے مٹ جانے والی، تم لوگ مجھے کبھی عزت کی نگاہ سے نہ دیکھ پاتے ـــــــ

خالد غیر تھا۔ اور پھر بے پناہ دولت نے اس کے پاس، دولت کی ویلیو ہی کھو دی ہے۔ بعد میں خالد نے مجھے بتایا کہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پھوپا صاحب کی ایک ہی لڑکی ہے، یہ جانے بغیر کہ میں کون تھی، اس نے پیام پیش کر دیا۔ یہ تو قسمت کے کھیل ہیں بچپن سے لے کر جوانی تک جس دولت نے میرا دل دکھایا سدا

وہ میرے قدموں میں آئی بھی تو کب اور کیسے ـــــــ کہ میں نے زندگی سے جیسے ناطہ توڑ لیا ـــــــ

ـــــــ میں زندگی کے کیسے کٹھن دوراہے پر کھڑی ہوں خدایا کہ نہ موت کی دعا مانگ سکتی ہوں نہ زندگی کی آرزو کر سکتی ہوں میں ـــــــ!

موت کے بارے میں سوچوں تو میری ننھی سی گڑیا کی موہنی شکل میرے بڑھتے قدم روک لیتی ہے۔ اُس نے کیا قصور کیا ہے کہ ماں کی محبت سے اتنی کومل عمر میں محروم ہو جائے اور جو جینے کے بارے میں سوچوں تو کیسے جیوں ـــــــ؟؟

اِک ایسی آگ سینے میں لگی ہے جو نظر تو نہیں آتی مگر میرا وجود بھسم کئے دے رہی ہے، میں زندگی بھر سلگتی رہوں گی ـــــــ یہ آگ کبھی نہ بجھے گی، جھوٹے دلاسوں اور تسلیوں سے بھی نہیں ـــــــ!!

ـــــــ بارش کے ننھے منے قطرو ـــــــ! میری جلتی ہوئی، زندگی میں ٹھنڈک بھر دو، ہیروں کی طرح چمکنے والی بوندو! ـــــــ میں اپنا آنچل پھیلا کر تم سے بھیک مانگتی ہوں کہ اس لمحہ بہ لمحہ بھسم کر دینے والی آگ کو ٹھنڈا کر دو ـــــــ رات کی اس بے پناہ تاریکی کو اپنے جھل مل کرتے حسن اُجالے بخش دو ـــــــ!

مگر میں کس قدر نادان ہوں ـــــــ کیا یہ آگ پانی کے قطروں سے بجھ پائے گی ـــــــ! اس آگ کو کوئی پانی

نہیں بجھا سکتا ——— اس تاریکی کو کوئی آفتاب منوّر نہیں کر سکتا ——— اس سیاہ رات کی کوئی سحر نہیں ——— دل کا شیشہ چُور چُور ہو چکا ہے ———

کتنی ساری کرچیاں میری روح میں پیوست ہو گئی ہیں ——— خدایا ——— !

میں نے دریچہ سے سر لگا کر آنکھیں موند لی ہیں۔ باہر بارش ہو رہی ہے، تاریکی نے ہر چیز کو ڈھانک رکھا ہے ———

آج کی رات کس قدر تاریک ہے، آج کے بعد سے تو ہر رات ہی تاریک ہے ——— !

میرا لہو لہان دل ڈوبا جا رہا ہے ——— اور میں ڈوبتے دل کو تھام کر تاریکی سے پوچھ رہی ہوں ———

"کیا سچ مچ اب کبھی سحر نہ ہو گی ——— ؟"

اِنتظار کے پھُول

وہ شام زندگی میں پھر کبھی نہ آئی۔
کیسے دکھ کی بات ہے کہ ایک ہی لمحہ میں جس پر اپنا سارا جیون وار دیا، اس کا نام نشان تک نہیں معلوم!
زندگی بھر کی غمناک داستان۔ محض چند الفاظ اور یادوں کا اثاثہ! مجھے نہیں پتہ تم کہاں ہو گے؟ اس وقت کیا کر رہے ہو گے؟ ہو سکتا ہے تمہارے پاس ایک خوبصورت سا گھر ہو، پیاری سی بیوی اور خوشی سے اچھلتے کودتے کئی بچے ہوں۔
تم تھکے ماندے دفتر سے آتے ہو گے، کتنے سارے لوگ تمہیں گھیر لیتے ہوں گے، تمہاری تھکن اک دم غائب ہو جاتی ہو گی۔ زندگی اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ تمہیں مصروف کر دیتی ہو گی۔ ایسے میں تم کیا جانو کہ کسی اور نے بھی تمہارا انتظار کیا ہے۔ ایسا انتظار جو کبھی ختم نہیں ہوتا، نہ ہو گا! دو چراغ آنکھوں

کے جو برابر جل رہے ہیں، اس امید اور آس میں کہ شاید تم کبھی لوٹ آؤ ــــــ

اِن چراغوں کی روشنی کبھی نہیں بجھ سکتی، جنہیں تمہاری، محبت نے زندگی بخشی ہو وہ کیسے فنا ہو سکتے ہیں؟

وہ شام ـــــ جب زندگی میں پہلی اور آخری بار میں نے محبت کا مزہ چکھا۔ وہ امرت جسے عورت صرف ایک بار پیتی ہے اور ساری زندگی اسی نشہ میں مدہوش رہتی ہے۔ شاید تمہیں یاد بھی نہ ہو، لیکن میں تو صرف اسی ایک لمحہ کی یاد لے کر جی رہی ہوں ـــــ

ـــــ کتنی سُہانی شام تھی، تنہائی کا زہر بوند بوند کرکے میرے دل میں اتر رہا تھا ـــــ

کہاں جاؤں ـــــ؟ ایسے حسین موسم میں گھر بیٹھے رہنا کس قدر حماقت ہے ـــ!

ایک بار بہت دن پہلے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایروڈرم گئی تھی۔ یہاں وہاں سارے میں ہم لڑکیاں اچھلتی پھری تھیں۔ دیوزاد مہیب پرندوں کی طرح اڑتے اترتے، بھاگتے طیاروں کو دیکھ کر ہم نے کیسے کیسے پروگرام آئندہ زندگی کے لئے مرتب کر ڈالے تھے، ساری دنیا گھومنے، جی بھر کے خوشیاں سمیٹنے کے ارمانوں بھرے خواب ـــــ!

پھر رات گئے جب لندن کے لئے روانہ ہونے والے جہاز، کے بارے میں لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوا تو ہم سب دَوڑی دَوڑی، اوپر ٹیرس پر پہنچ گئیں اور جُھک جُھک کر ان خوش نصیبوں کو دیکھنے

لگیں. جو بیچے اپنے اپنے بیگ، پرس، اوور کوٹ، سوئیٹر سنبھالے، اپنے اپنے بچوں کی انگلیاں، شوہر بیویوں کے ہاتھ تھامے رنگین خوابوں کو دل میں بسائے، نئی دنیاؤں کی تلاش میں اڑنے جا رہے تھے.

اس لمحہ میں نے بھول کر بھی نہ سوچا تھا کہ زندگی اور نئی دنیا کی کھوج میں، میں ہمیشہ تنہا ہی بھٹکتی پھروں گی!

'آج بھی میں کیوں نہ ایرپورٹ چلی جاؤں ـــــ؟' میں نے دل میں سوچا اور فوراً آمادہ ہو گئی ـــــ ایرپورٹ کی دنیا بھی کیسی رنگین اور جھلملاتی دنیا ہوتی ہے. گھنٹوں گزر جاتے ہیں اور وقت کا احساس تک نہیں ہوتا.

پتہ نہیں کیوں اس دن میں نے اتنا بھرپور سنگار کیا کہ آئینہ دیکھ کر خود ہی حیران رہ گئی. کوئی زیور ایسا نہ چھوٹا جس نے مجھے، سہاگن ہونے کی گواہی نہ دی ہو، آنکھوں میں کاجل کی گہری گہری لکیریں کھینچنے کے بعد میں خود ہی ہنس پڑی.

'ارے میں یہ سنگھار کس کے لئے کر رہی ہو آخر ـــــ؟'

شاید وہ میرے دلہناپے کی پہلی اور آخری گھڑی تھی

چلتے چلتے میں نے ایک تازہ تازہ کھلے گلاب کو اپنے جوڑے میں سجا لیا، یہ گویا میرے دلہناپے کی تکمیل تھی، اس دن میں راہ چلتی تھی تو لوگ مجھے دیکھ کر دانتوں میں انگلی دبا لیتے تھے، ٹھٹک جاتی تھی تو لوگ گڑبڑا کر ٹھوکر کھانے لگتے تھے ـــــ میں نے گھبرا کر ایک ٹیکسی ہائر کر لی تھی. شاید مجھے ڈر تھا کہ ایسا

نہ ہو کہ میرا سنگھار باسی ہو جائے جس کے لئے انتظار کیا ہے اس کے دیکھے دیکھے تک میں مرجھا نہ جاؤں!

رات اپنی ساری خوبصورتیوں اور دلنوازیوں کے ساتھ میری منتظر تھی۔ لمبے چوڑے لاونج میں جیسے ہی میں نے قدم رکھا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یکبارگی ساری روشنیاں ماند سی پڑ گئی ہیں، اپنے حُسن کا یہ بے پناہ احساس اس لمحہ سے پہلے کبھی تو مجھ میں نہ جاگا تھا۔ آخر یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا؟

میں گھبرا سی گئی، کتنی ساری نگاہیں میرے چہرے کا طواف کر رہی تھیں!! میں نے اپنی باریک ریشمی ساری کا پلو اپنے چہرے اور سر کے گرد لپیٹ لیا، کسی خوش ذوق نے فقرہ بھی کسا:

"ارے بھائی چاند چاند ہی ہوتا ہے، کہیں بدلیوں سے بھی حُسن چھپایا جا سکا ہے؟"

میں نے سہم کر اِدھر اُدھر دیکھا، یہ کیا حماقت میں نے کر لی تھی جو اکیلی ہی چلی آئی، کم سے کم کوئی سکھی سہیلی ہی ساتھ ہوتی، اکیلے پن کے احساس سے میرا دل نہ جانے کیوں اداس ہونے لگا۔

اسی دم لاؤڈ اسپیکر پر اناؤنسر نے لندن کی پرواز کا اعلان کیا، یہاں خالی اور اکیلی بیٹھی ہوں۔ ٹیرس پر جاکر جہاز کو پرواز کرتے کیوں نہ دیکھوں؟ اور میں ادہر چلی گئی

مسافر اپنے اپنے سامان کے وزن اور چیکنگ سے نپٹ کر ایک ایک کر کے نیچے کھلے احاطہ میں جمع ہو گئے تھے، جہاں سے انہیں چل کر جہاز پر سوار ہونا تھا۔

الوداع کہنے والے اب وہاں تک نہیں جا سکتے تھے اس لئے وہ سب لوگ اوپر سرا ٹھاکر ٹیرس پر کھڑے ہوئے اپنے عزیزوں رشتے داروں پیاروں سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک آدھ بات سنائی دیتی، ایک آدھ شور شرابے میں کھو کر رہ جاتی ــــــــــ

ــــــــــ ایک شریر سا لڑکا اوپر کھڑی لڑکی سے اشارے سے سگریٹ مانگ رہا تھا۔ لڑکی نے ادھر ادھر دیکھا اور دبے دبے لہجہ میں بولی ــــــــــ

"لیکن وہاں سگریٹ پینا منع ہے،،

"یہاں نہیں وہاں، رن وے کے پاس، میں تب تک بجھا دوں گا ــــــــــ پلیز!"

"اچھا میں جلا کر پھینکتی ہوں، تم ذرا پرے ہٹ جاؤ،،

ایک خوبصورت سی عورت میرے پاس کھڑی بار بار گیلی آنکھیں پونچھ لیتی اور پھر زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر بکھیر کر نیچے جھک جاتی چوتھی بار میں نے اسے دیکھا تو وہ شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ خود ہی بول اٹھی ــــــــــ

"میرے شوہر لندن جا رہے ہیں، میں ایسی حالت میں نہیں کہ ان کے ساتھ جا سکوں" اور وہ شرما گئی ــ صرف چند دنوں کی بات ہے مگر کمبخت آنسو ــــــــــ"

اس نے پھر جھانک کر دیکھا، میں نے بھی دیکھا، اس کا شوہر وہیں ہے۔ زور سے بڑے پیار بھرے اصرار سے کہہ رہا تھا "تم ایسے کرو گی تو میں ابھی واپس آجاؤں گا"۔

محبت ____ محبت ____ محبت !! کسی کے چہرے پر مسکراہٹیں تھیں، کسی کی آنکھوں میں آنسو ____ ایک ہی جذبہ کارفرما تھا۔ ایک ہی حقیقت ____!

اب جہاز کی پرواز میں چند منٹ رہ گئے تھے۔ نیچے ٹھہرے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے جہاز میں سوار ہونے کے لئے جانے لگے۔ سامان سنبھالتے ہوئے، مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے ____ ہاتھوں میں۔ گلے میں پھول مالائیں، گلدستے، محبتوں کے مٹ جانے والے نقوش ____ پھول جو محبت کے اظہار کی علامت ہیں، جو، مرجھا جاتے ہیں، مٹ جاتے ہیں، لیکن محبت کی دنیا میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں، جو محبت کو خوبصورتی بخشتے ہیں۔

اب ٹیرس کی ریلنگ سے کئی لوگ چمٹے ہوئے تھے، ہر جانے والے کو کوئی نہ کوئی سی آف کرنے، وش کرنے، دعا دینے، خدا حافظ کہنے والا موجود تھا۔ دعاؤں کے پھول نچھاور ہو رہے تھے۔

اسی لمحہ ____ اسی لمحے میں نے ایک اداس چہرہ دیکھا گہرے رنگ کا سوٹ۔ کندھے سے اوور کوٹ لٹکا ہوا ایک ہاتھ میں بڑا سا بیگ۔ بار بار وہ سر اٹھا کر ٹیرس کی اور دیکھتا اور ہر بار ایسا کرتے میں اس کے ماتھے پر پڑا ہوا، بالوں کا گھنا گچھا پیچھے جھول جاتا، ہر آگے بڑھتے قدم کے ساتھ

وہ پیچھے بھی دیکھ لیتا ـــــــ ان نگاہوں سے کہ شاید کوئی مجھے بھی خدا حافظ کہہ دے، شاید کوئی مجھے بھی بھگوان کو سونپ دے شاید کوئی مجھے بھی وِش کر دے! اس کے ہاتھوں میں کوئی پھول تھا نہ گلے میں کوئی مالا، شاید کسی نے اسے محبت کے دو بول، بول کر وداع نہیں کیا تھا، شاید اسے یہ آس تھی کہ کوئی آ ہی جائے گا، جاتے جاتے ــــ محبت بھری نگاہ کا سایہ پڑ ہی جائے گا ـــــــ جب ہی تو وہ رہ رہ کر، بار بار پلٹ پلٹ کر دیکھتا تھا ـــــــ

لیکن اتنے سارے لوگوں کے ہجوم میں بھی وہ تنہا ہی تھا ـــــــ

اور یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ میں خود بھی حیران رہ گئی۔ میں نے جب دیکھ لیا کہ اس کے ساتھ کسی کی دعا نہیں ہے تو عورت پن کی ساری محبتوں، ہمدردیوں اور بے پناہ پیار کے ساتھ میں نے اپنے جوڑے کا پھول نکال کر اس کی طرف اچھال دیا۔ پھول اس کے قدموں میں جا گرا اور پھول کو اٹھاتے اٹھاتے اس نے جن نظروں سے مجھے دیکھا، وہ نظریں !! ـــــــ وہی نظریں میرا سہاگ بن گئیں !!

چند ثانیے وہ وہیں ٹھٹک کر کھڑا رہ گیا، حیران حیران سی، کچھ شرمندہ شرمندہ سی نگاہوں سے وہ مجھے دیکھا کیا۔ پھر ایک دم اس کے چہرے پہ گلاب سے کھل اٹھے۔ سیدھے ہاتھ کا بیگ اس نے بائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور پھر،

ہوائی جہاز تک پہنچنے تک، ہر دو قدم کے بعد مڑ کر مجھے دیکھ لیتا اور وِش کر لیتا ـــــــ

جب جہاز کی سیڑھی چڑھ کر وہ جہاز کے اندر داخل ہونے کو تھا، تو اب ہمارے درمیان اتنی دوری حائل ہو چکی تھی کہ چہروں کے نقوش دھندلا چلے تھے ـــــــ

لیکن پھر بھی میں نے دیکھا کہ ایک لمحہ کو وہ رُکا، پیچھے مڑ کر دیکھا، خوب زور زور سے ہاتھ ہلایا اور اندر چلا گیا۔

اس لمحہ تو مجھے یہ خوشی تھی کہ چلو میں نے کسی کا دل رکھ لیا ـــــــ کسی کو اداس ہونے سے بچا لیا۔ تنہائی کا زہر کسی کی روح میں گھلنے نہ دیا ـــــــ لیکن اس کے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی اِک دم میرے حلق میں جیسے کچھ اٹکا شاید یہ آنسو تھے ـــــــ

اور پھر اِک دم میں نے بھری دنیا میں اپنے آپ کو تنہا پایا۔ تب میں نے جانا کہ میں نے آج اپنا دل کھو دیا ہے۔ کسی کو خوشی دے کر اپنی زندگی میں اداسیوں کا رنگ گھول لیا ہے۔ تنہائی کا زہر قطرہ قطرہ میرے جیون میں ٹپکے گا اور میں، یونہی سر ٹپکتی رہوں گی ـــــــ

وہ دن ـــــــ اور آج کا دن ـــــــ تم کیا۔

میرا تو دیس ہی میرے لئے بدیس ہو گیا۔ قطرہ قطرہ۔

والے آنسوؤں کا حساب تمہیں کیا دوں ____؟ زندگی کی ساری خوشیاں ایک ہوائی جہاز کی گھڑگھڑاہٹ سے وابستہ ہو کر رہ گئیں ____ ایک دن ، دو دن ، ایک ہفتہ ، دو ہفتے ، ایک ماہ ، دو ماہ ____ کتنے ماہ و سال آتے گئے ، گذرتے گئے اور میں جیسے اس ایروڈرم اور ٹیرس کی دیوانی بن کر رہ گئی ____ جہاز اترتا تو میں بھی پاگلوں کی طرح نیچے لاؤنج میں آ کھڑی ہوتی . شاید وہ چاند کبھی نظر آجائے ، جو ایک لمحہ کو میرے گھور اندھیارے جیون میں چمکا تھا . شاید وہ نگاہیں پھر کبھی میری نگاہوں سے مل جائیں جنہیں بنا سوچے سمجھے ہی میں نے اپنا سہاگ مان لیا تھا ____

لیکن کتنی رتیں آئیں اور گئیں ، کتنے جاڑے ، کتنی برساتیں . کیسے کیسے قاتل موسم ، کیسی کیسی جان لیوا ہوائیں چلیں ، لیکن تم نہ پلٹے اور آنکھوں کے دیئے اپنی لو کم کر بیٹھے ____ بالوں پر بگلوں کے پروں کا گمان تو نہیں ہوتا ، لیکن یہ بھی بتا ہی دوں کہ جیسے ساری جوانی سفیدیوں کی نذر ہو گئی .

____ تم کون تھے ؟ کہاں سے آئے تھے ؟ کس طرح مجھے ہر کر چلے گئے ؟

سوچتی ہوں تو یہ سارا ایک کھیل سا نظر آتا ہے ، نہ تمہاری ذات پات معلوم ، نہ مذہب ، نہ نام ، نہ نشان ، نہ گھر دوار ____ پھر بھی میں نے تمہیں اپنا سب کچھ مان لیا ، تمہارے لئے ہر ایک جگہ سے ناطہ توڑ لیا . کس لڑکی کے

پیام نہیں آتے ۔ مجھے بھی ایک سے بڑھ کر ایک پیام آئے۔ لیکن میں نے جو اُن نگاہوں کو اپنا سہاگ مانا پھر کسی در پر یہ سیس نہ جھکایا ——

نہ جانے دل کیوں یہ کہتا ہے کہ تم آؤ گے، کبھی نہ کبھی ضرور آؤ گے۔ اسی لیۓ میں نے آج تک کبھی سفید لباس نہیں پہنا —— میں تو سدا سہاگن ہوں نا ؟ سہاگنیں تو ہمیشہ رنگین لباس پہنتی ہیں۔ بھلا جو کبھی تم آؤ اور مجھے سفید ساری پہنے دیکھو تو کیا سوچو گے ؟ لیکن تم آؤ تو !! —— کوئی سنے تو یقین نہ کرے، بھلا ایسی باتیں زندگی میں ہوا کرتی ہیں —— ؟

لیکن تم کیا جانو محبت کے ترسے ہوئے اس دل کو تمہاری وہ نگاہ کیسے سیراب کر گئی۔ وہ نگاہ، وہ چاند جو زندگی کے تاریک آسمان پر صرف ایک ہی لمحہ کو چمکا اور ہمیشہ کے لئے انتظار کے کبھی نہ مرجھانے والے پھول دے گیا ——!!

اِک چنبیلی کے منڈوے تلے

"میرے چاند

خدا کرے تم اتنے برس زندہ رہو جتنی بار چاند چڑھا ہے اور جتنی بار سورج اس آسمان پر چمکا ہے۔ خط لکھنے کے لیے قلم ہاتھ میں سنبھالتی ہوں تو کچھ سوجھتا نہیں۔ تمہاری پیاری صورت آنکھوں میں جھومنے لگتی ہے۔ ایسے میں لکھ بھی کیا سکتی ہوں؟

یہ چند حروف تو اس لیے لکھ کر بھیج رہی ہوں کہ تمہیں ...دلا سکوں، آج کی رات آم کے اسی گھنے پیڑ تلے میرا انتظار ...نا، جس کے سائے میں بابا نے ایک پیاری سی کیاری بنا ...ی ہے اور جس میں کھلی چنبیلی سے سارے میں مہک رچی

رہتی ہے ـــــــ

آج اسی چنبیلی کے منڈوے تلے میں تمہاری ہو جاؤں گی نا ـــــ! میرا دل انجانے وسوسوں اور نئے پرانے ارمانوں سے دھک ہو رہا ہے ـــــ لیکن مجھے تمہارے پیار پر اتنا ہی بھروسہ ہے جتنا خدا کی ذات پر ـــ اسی لئے تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تمہارے پاس آ رہی ہوں ـــــ

یہ سچ ہے میرے چاند! کہ بابل کی گلیوں سے ہزار محبت ہونے کے باوجود ایک وقت وہ آتا ہی ہے، جب یہ ساری محبتیں زنجیر لگنے لگتی ہیں اور جی چاہتا ہے، جلد سے جلد اس قید سے چھٹکارا ملے، میں آج کتنی خوش ہوں، اس کا احساس سوائے تمہارے اور کون کر سکتا ہے ـــــ؟

آج میں اس بات پر مغرور ہوں کہ بابا نے مجھے پڑھنا لکھنا سکھا کر اس لائق تو کیا کہ میں اپنے احساسات تم تک پہنچا سکوں ـــــ یہ سب تمہیں اس لئے لکھ رہی ہوں کہ مجھے یقین ہے، ملنے پر زبان میرا ساتھ نہ دے پائے گی زبان میرا ساتھ نہ دے سکے تو کیا غم ـــــ قلم تو میرا اپنا ہے ـــــ

تو چاند ـــ! اب میں چلوں ـــ؟ خدا کرے یہ خط تم تک اسی طرح آسانی سے پہنچ جائے جس طرح بلا کسی کھٹکے میں تمہارے خوابوں میں چلی آتی ہوں۔ دل کے سارے پیار کے ساتھ ـــــ

تمہاری ہی
عاشی

خط، پیار کی خوشبو سے مہکتا ہوا خط بابا کے بوڑھے لیکن مضبوط ہاتھوں میں کانپ رہا تھا، کپکپاہٹ جو کمزوری سے نہیں، غصّہ ضبط کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

ہنھ! ــــ تو یہ ہے شریفوں کی روسیاہ اولاد اسی لئے تو کہتے ہیں لڑکیوں کو پڑھانا لکھانا نہیں چاہیے یہ کرتوت، بدنامی کے داغ ــــ اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا ایک بار پھر اس نے اس لرزتی ہوئی پیار کی کائنات پر نظر ڈالی جہاں باریک اور خوشنما لکھاوٹ میں گھرا 'میرا چاند' مسکرا رہا تھا

بے حیائی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کنواری لڑکی اور کسی غیر مرد کو 'میرے چاند' کہہ کر مخاطب کرے! بابا کی آنکھوں سے خون سا چھلکنے لگا۔

"بابا کھانا تیار ہے۔ روٹی کھا لیجئے" دنیا بھر کی مٹھاسوں میں ڈوبی یہ رسیلی آواز سن کر بابا غصّے سے کھول گیا۔

"روٹی کیوں کھاؤں، تجھ ہی نہ کھا لوں؟"
اس نے چلا کر کہنا چاہا لیکن مصلحتاً ضبط کر گیا۔ کمرا تھا

اور کڑوی آواز سے بس اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔

"آج کھانا نہیں کھاؤں گا"

جی تو یہ چاہتا تھا بات اس طرح پوری کرے "رات کو خون جو پینا ہے" لیکن ٹال گیا۔

بابا کا جواب سن کر عائشہ جھومتی ہوئی باہر آئی۔ وہ چل کیا رہی تھی۔ چہرے پر گلال بکھرا ہوا تھا۔ اور رات کے رت جگے کے تصور سے آنکھوں میں ابھی سے گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔

"کیوں بابا؟ جی اچھا نہیں ——— ؟" اس نے پاس آکر بڑی ملائمت سے پوچھا

"اچھا بھلا ہوں، لیکن بھوک ہی نہیں تو کھاؤں گا کیسے ؟"

اس نے مارے غصّہ کے منہ پھیر لیا

عائشہ کا دل باپ کی اس ادا سے بجھ سا گیا۔ اب وہ اکیس سال کی ہو رہی تھی اور اس کی یادداشت میں ایک بھی لمحہ ایسا نہ تھا جب باپ نے یوں بے رخی سے بن بات منہ پھیر لیا ہو۔ اور پھر آج ؟

آج تو ویسے ہی اس کا دل میکہ چھوٹنے کے خیال سے ٹوٹا ٹوٹا تھا۔ ویسے ہی اس کے دل پر آنسوؤں سے بھرے ڈھیروں بادل چھائے ہوئے تھے، ایسے میں بابا یوں ناراض ہیں۔

وہ آنے والی خوشیوں اور موجودہ غموں سے چمکتا اور دمکتا چہرہ اٹھائے کچھ دیر تو باپ کو دیکھتی رہی پھر سر جھکائے اندر چلی گئی۔

اور کوئی وقت ہوتا تو بابا کبھی اسے اس طرح اداس نہ جانے دیتا۔ بیوی کی موت کے بعد سے تو اس کا جان اور ایمان سب کچھ عائشہ ہی تھی ——

پورے اکیس برس تک اس نے کس پیار سے اسے پالا تھا کبھی بیٹی کو ایک ہلکی سی جھڑکی تک نہ دی۔ ایک سے ایک اچھا پیام اس کے لیے آیا لیکن اس نے ہر پیام کو یہ سوچ کر رد کر دیا کہ جس طرح میں نے اپنی عائشہ کو لاڈ پیار اور آرام سے رکھا ہے —— اور کوئی نہ رکھ پائے گا ——

جب بھی جس چیز کی فرمائش کی۔ اپنی بے مائیگی کے باوجود بیٹی کی خواہش پوری کی۔ غریبی کے ایام میں خود بھوکا رہ کر ننگا کھلا رہ کر اسے کھلایا پہنایا۔ لیکن یہ کبھی نہ ظاہر ہونے دیا کہ ایک سید کو جو اتنا خوددار اور عزت مند ہو کہ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتا ہو، یہ سب کرنے میں کتنی تکالیف کا سامنا ہوتا ہے اور آج —— ! ——

آج اسی بیٹی نے محبتوں کا یہ صلہ دیا۔ عزت ڈبونے میں کوئی کسر ہی باقی نہ رکھی ——

آخر میں کس دنیا میں جی رہا تھا کہ اس حد تک بات بڑھ گئی

گئی اور مجھے پتہ ہی نہیں اور آج بھی کیا پتہ چلتا اگر وہ خنزیر کی اولاد الّو گھبرا کر یہ بھاگ نکلتا ـــــــ

ہوا یہ کہ آج صبح ہی صبح بابا جب مسواک لے کر اپنے باغیچہ کی منڈیر پر بیٹھا ہی تھا کہ ادھر سے الّو گزرا۔ بابا نے آپ ہی آپ سارے گاؤں کے بچوں بڑوں کی ذمہ داریاں اپنے ذمہ لگا لی تھیں کہ کون کدھر جاتا ہے، کون کیا کرتا ہے فلاں نے آج عربی کا درس لیا یا نہیں، فلاں نے قاعدے کا پہلا سبق یاد کیا یا نہیں ـــــــ

پھر بابا کی مذاق کرنے کی بھی عادت تھی۔ چھوٹے بڑے سبھی ان کی زد میں رہتے تھے۔ سبھی لوگ بابا کی بزرگی اور بڑے پن کی وجہ سے ان کا لحاظ کرتے تھے۔ بچوں کا تو سوال ہی کیا، بڑوں میں سے بھی بابا نے جو بات جس سے کہہ دی اس کا مان لینا گویا فرض ہو گیا ـــــــ

یک دن پہلے الّو نے مدرسے میں عربی کا درس نہیں لیا تھا، یہ بات بابا کو معلوم تھی آج صبح ہی صبح اسے جو اس طرح جلدی جلدی بھاگتا دیکھا تو بابا کی شرارت کی رگ پھڑکی بیٹھے بیٹھے بولا ـــــــ

"کیوں رے! کل مدرسے سے غیر حاضر رہا اور آج ماں کی چوری سے یہ نیفے میں کیا اڑس کر بھاگا جا رہا ہے"۔

بچہ پھر بچہ ٹھہرا۔ اس کا ہاتھ ایک دم نیفے پر گیا اور ہکلا کر بولا "م ـــــ م ـــــ میں ـــــ نے کچھ بھی ...."

لیکن اس کی بوکھلاہٹ سے بابا کو شک ہوا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے مسواک منڈیر پر رکھ کر بابا الّو کی طرف لپکا تو الّو سرپٹ دوڑا۔

بچپن اور بڑھاپے کی دوڑ میں بڑھاپا ہی جیتا کیونکہ بڑھاپا راستی پر تھا اور بچپن جس کا نام الّو تھا، بچے کی بھول میں راستے سے ہٹ کر پگڈنڈی پر اتر رہا تھا۔ کہ اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا اور پھر ــــــ اس کی گردن بابا کے مضبوط ہاتھ میں تھی۔

بابا نے اس کا بنیفا ٹٹولا تو پرچہ کھڑکھڑانے کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحہ نیفے سے خط اور جیب سے موتی چور کا ایک لڈو پٹ سے زمین پر آن گرا جو غالباً رشوت کے طور پر اسے ملا ہوگا، ننھے نامہ بر نے بغیر کسی پوچھ تاچھ کے حلفیہ بیان دے دیا۔

"عائشہ باجی میرے ہاتھ لال بھائی کو ہمیشہ خط بھجواتی ہیں بابا ــــــ! پر میرا اس میں کیا قصور ہے، میں تو سبھی کا کام کرتا ہوں۔ اُن کا بھی کر دیتا ہوں، مگر وہ کہتی ہیں کہ میری بات کسی سے مت کہنا۔ اس لئے میں ــــــ ڈرتا ہوں ورنہ ....."

بابا کے کان اس کی آواز پر کب تھے وہ تو اس وقت اپنے آپ کو پاگل سا محسوس کر رہا تھا:

لال خاں ــــــ وہ خونی ــــــ وہ حرامزادہ

وہ پٹھانوں کی کمینی اولاد ــــ! اور اس کے نام ایک سیدزادی کا یہ خط ــــــ ؟؟

اور آج کی رات! یہ شادی کی نام نہاد رات ــــ یہ عزت لوٹ کر چل دینے کی کمینے پن کی انتہائی رات ــــ لیکن جب اپنا ہی پیسہ کھوٹا ہے تو پرکھنے والے کا کیا دوش ــــ اس کتیا نے یہ تو سوچا ہوتا کہ اس طرح عزت گنوا کر بھاگ کر جائے گی، تو اپنی زندگی تو تباہ کرے گی ہی، باپ کے منہ پر بھی زمانہ تھوکے گا لیکن یہ حرام زادہ.....

ایک خیال دوسرے خیال سے ٹکرا جاتا اور پہلا خیال وہیں دم توڑ جاتا. ایک سوچ دوسری سوچ سے ٹکرا کر اس کے دماغ کے پرخچے اڑا رہی تھی ــــ

"اچھا بٹیا ٹھیک ہے. آج تمہیں ضرور اس قید سے چھٹکارا مل جائے گا جس کا ذکر تم نے اپنے خط میں کیا ہے ــــ!!" اس نے سوچا ــــ

دن بھر بابا ـــ اپنے دروازے کے سامنے بیٹھا بندوق چمکاتا رہا تاکہ کوئی نامہ بر دروازے سے داخل نہ ہونے پائے.

عائشہ نے ایک دوبار آکر کھانے کو پوچھا بھی، پھر اس کا [illegible] انداز دیکھ کر پلٹ پلٹ گئی. شام کو وہ، میٹھا [illegible] آئی اور بولی.

"بابا! دن بھر نہ کھایا نہ پیا، یہ بندوق کی صفائی کیوں ہو رہی ہے؟"

"آج بہت دنوں بعد شکار کھیلنے کو جی چاہتا ہے۔ بیٹی" صبح سے پہلی بار بابا ذرا بشاشت سے بولا۔

لیکن اس بشاشت کے پیچھے جو گہرا طنز چھپا ہوا تھا، اسے عائشہ نہ سمجھ سکی، ایک دم وہ بچوں کی طرح باپ کے گلے میں جھول سی گئی۔

"بابا اگر آپ ہرن ماریں گے تو اس کی کھال سے میں جھولنا بنواؤں گی، اس میں بالکل سردی نہیں لگتی۔"

بابا کا دل ایک لمحے کو کانپ سا گیا۔ کیا گھرے پیار کو اسی دن کے لئے پروان چڑھایا کرتے ہیں کہ اپنے ہی ہاتھوں بندوق سے بھون دیں، لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ ٹھٹھک گیا۔

"بیٹی اب کی سردیوں میں تجھے کسی جھولنے، کسی شال کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔"

"کیوں بابا؟"

حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل کر اور بھی خوبصورت ہو گئیں اور وہ بابا سے الگ ہو کر ٹھٹھک سی گئی۔

وہ سنبھلا ——— "میں اسی مکان کو ایسا آرام دہ بنا دوں گا کہ سردی گرمی اثر ہی نہ کرے۔"

وہ خوش ہو گئی، پھر پیار سے بولی

"بابا میری ایک بات آپ مانیں گے"
"ہاں ہاں بول"
وہ بناوٹی خوشدلی سے بولا
"بابا آپ کے پاس جو چھوڑے اور چھاگلیں رکھی ہیں وہ آج مجھے پہننے کو دیدیجئے نا"
"ضرور ضرور ____" بابا جھوم کر بولا "اسی دن کے لئے تو تیری ماں کے زیورات اٹھا کر رکھے تھے کہ تو پہننے کے قابل ہو جائے۔ لیکن جائے گی کہاں پہن کر؟"
وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیٹی کو ہلکا سا بھی شبہ ہو جائے۔ کہ باپ اس کے راز سے آگاہ ہے ____
"بابا آج میں اور میری ساری سہیلیاں مل کر ڈنڈارلے کرنے والی ہیں۔"
بابا نے کچھ کہے بغیر چابی اس کے حوالے کر دی۔ عائشہ رقص کرنے کے سے انداز میں چلی گئی۔

شام پڑے سرخ سوجی آنکھوں سے عائشہ باپ کے پاس آئی اور گلے لگ کر بولی۔
"بابا! واپسی میں مجھے دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہوئیے گا کیونکہ ڈنڈار سکینہ کے گھر ہے اور اس کا گھر

لے رت جگا، جس میں رات بھر پیالمن کے دیہاتی گانے گائے جاتے ہیں۔

بہت دور ہے "

اس کی آواز جس میں رہ رہ کر گھنگرو چھنکا کرتے تھے، آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی بابا اب بھی کچھ نہ بولا جانتا تھا گھر چھوڑ کر جانے کا سارا دکھ آنکھوں کی راہ سمٹ آیا ہے، ایسے میں وہ ذرا بھی چھیڑتا تو ندیاں بہہ جاتیں، وہ مصلحتاً خاموش رہا ———

عائشہ کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد وہ اٹھا، بندوق سنبھالی اور گاؤں کے آخری کنارے پر واقع اپنی امرائی کی طرف چلا۔ جس کے نیچے اس نے تھوڑی سی سبزی اور پھول اُگا کر اسے کیاری سا بنا دیا تھا ———

———

چھم چھم کرتی عاشی تیزی سے آگے بڑھی اور لال خاں کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی ———

" میں آگئی میرے چاند !"

بابا دم سادھے، سانس روکے، دور آم کے گھنے پیڑ کے موٹے تنے کے پیچھے سے دیکھا اور سنا کیا۔

لال خاں نے اسے جھک کر دونوں ہاتھوں میں بھر کر اوپر اٹھایا۔ کالا دیو ——— اس کا نام لال خاں کس نے رکھا ہوگا ———،

بابا نے جل کر سوچا، لیکن چڑھتے چاند کی روشنی میں جب بابا نے اس کا چہرہ دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گیا ——— چہرے

پر وہ نمک برس رہا تھا کہ دیکھنے سے منہ میں پانی آجائے، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، مضبوط اعضا ــــــ اس نے کھلونے کی طرح عاشی کو اٹھایا اور کھڑا کر دیا۔

"تم میرے قدموں میں بچھنے کے لئے نہیں، دل میں آنکھوں میں بسنے کے لئے ہو رانی ــــــ!"

عائشہ کچھ نہ بولی۔ ایک ہی سسکی نے اس کا سارا جسم ہلا دیا ــــــ

تھوڑی دیر بعد کہنے لگی ــــــ

"کاش بابا خود مجھے اپنے ہاتھوں وداع کرتے"

"یہ ناممکن تھا عائشہ ــــــ"

لال خاں سنجیدگی سے بولا

"تم اپنے باپ کو جانتی ہو، وہ پرانی روایتوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ زمانے کی سوچتے ہیں دلوں کی نہیں ــــــ تمہیں معلوم ہے عاشی، میں نے تمہیں حاصل کرنے کے لئے کیا کیا نہیں کیا، شہر جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی، عزت کی نوکری حاصل کی، شریفانہ طور پر پیغام بھجوایا ــــــ لیکن بابا جب بھی ملے، مجھے انہوں نے حقیر ہی سمجھا ــــــ!

جانے کس نے میرے خاندان میں کبھی خون کیا ہوگا اس کے حوالے سے سدا مجھے خونی ہی کہہ کر پکارا، میں یہ سب کچھ سہہ سکتا تھا لیکن تمہاری رفاقت، تمہاری جدائی

نہیں سہہ سکتا تھا۔ اور اسی لئے میری عاشی میں نے تمہیں گھر چھوڑنے پر اکسایا ______ گھر سے بھاگنے پر نہیں ______!

اس لئے کہ تم ایک شریف اور سیّد باپ کی بیٹی ہو میں اپنے ساتھ قاضی کو بھی لایا ہوں۔ پہلے وہ نکاح کی رسم اس جنبیلی کے منڈوے تلے ادا کریں گے، پھر تم بابل کی گلیوں سے سچ مچ دلہن بن کر وداع ہو گی ______

اُس وقت تک میں تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لوں گا ______ میری رگوں میں بھی شریف باپ کا خون ہے رانی ______؟"

عائشہ میکے سے جانے والی دلہنوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا دل شک اور یقین کے مابین ابتک ڈگمگا رہا تھا ______

سنبھل کر بولی

"میرا دل گھبرا رہا ہے۔ جلدی سے یہاں سے نکل چلو"

بڑے پیار سے وہ بولا

"تم سمجھتی نہیں ہو جان! اگر ہم یونہی نکل گئے تو دوسرے گاؤں والے ہمیں بھگوڑا کہیں گے ______" میں کیسے سمجھاؤں کہ میں تمہیں ذلّت اور بے عزّتی سے زندہ نہیں رکھنا چاہتا ______ میں تو چاہتا ہوں کہ میری رانی جب بھی چلے غرور اور فخر سے سر اونچا کر کے چلے"

پھر لال خاں نے روائتی فلموں کے ہیرو کی طرح تین بار تالی ٹھونکی۔

اور عقب سے ایک بڑے میاں نکل کر آئے قرآن شریف درمیان میں رکھ کر انہوں نے ذرا گھبرائے ہوئے انداز میں لال خاں کے قوی ہیکل جسم کی طرف دیکھا۔ پھر ڈری ہوئی آواز سے بولے

"لیکن میاں گواہ کہاں سے آئیں گے۔ آپ کو معلوم ہے اسلامی شریعت کے مطابق دو گواہوں کا بوقت عقد موجود ہونا ضروری ہے ــــــ؟"

"قاضی صاحب! ایسے پاکیزہ دلوں کو سوائے خدا کے بھلا اور کس گواہ کی ضرورت پڑ سکتی ہے ــــــ"

بابا نے ایک ساتھ خوشیوں اور دکھوں سے بوجھل دل سے کہنا چاہا ــــــ!

لیکن آنسوؤں نے اس کی گویائی چھین لی تھی۔

برسات

میں نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا دل تھام لیا۔

نیلے رنگ کی لمبی سی کار پورٹیکو سے نکلی۔ اور چکر کاٹ کر پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرا دل بھی باہر نکل پڑے گا۔

"تو عارف چلا گیا!"

میں نے جیسے خود کو سنایا —— "ہمیشہ کے لئے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے —— ! اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ نہ آنے کی تمنا کرے گا"

میری آنکھیں برسات کے پہلے پہلے بادلوں کی طرح رُک رُک کر برسنے لگیں۔

آج سے بہت پہلے ایک بار اور بھی عارف گیا تھا۔ جب میں یونہی اداس دل اور روتی آنکھیں لئے اپنے کمرے میں

جا پڑی تھی تو سامنے ہی میز پر مجھے کاپی میں لکھا ہوا ایک شعر نظر آیا تھا ؎

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

میں اندر کی طرف لپکی، شاید آج بھی عارف نے کچھ لکھ دیا ہو ——— میں نے کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا۔ کاپیوں کے صفحات بکھیر دیئے۔ کتابیں الٹ پلٹ کر ڈالیں مگر، بےچین دل کی، وہ لوٹ آنے کی، وہ تمنا آج کہاں کھو گئی؟ آج کوئی مجھے یہ کیوں نہیں سناتا ؎

اٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

آج میری بزم سونی ہو گئی ہے، جانے والا چلا گیا۔ اب نہ وہ تمنا ہے نہ لوٹ آنے کی وہ تڑپ۔ اب صرف برسات ہے، آنکھوں کا پانی، جو موقعے بے موقعہ برس برس کر پرانی یادوں کو سیراب کیا کرے گا، یادوں کی یہ بستی کبھی ویران نہ ہو گی، سدا لہلہاتی رہے گی ——— عارف نے ایک بار مجھ سے پوچھا تھا۔

"شوبی! تمہاری آنکھیں سدا گیلی گیلی سی نظر آتی ہیں، کیا تم اکیلے میں روتی رہتی ہو؟"

میں نے ہنس کر کہا تھا۔

"ایسی بات تو نہیں، مگر جانے مجھے کیوں برسات

کا موسم اتنا پسند ہے شاید.....''
وہ بات کاٹ کر بولا تھا۔
''شاید اسی کی مناسبت سے آنکھیں بھی برسات پر تلی رہتی ہیں''
میں نے دھیرے سے جواب دیا تھا
''میرا نام بھی تو شبنم ہے نا ــــــ شبنم! جو سدا روتی رہتی ہے''
برسات کی بات پر مجھے اچانک وہ شام یاد آ گئی ہے،
میں اور باجی ڈرائینگ روم میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ باہر چھم چھم، برسات ہو رہی تھی۔ ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے باجی نے کریم کو تھرماس دے کر آئس کریم لانے کے لئے بھیجا تھا باجی کو برسات میں آئس کریم کھانے کا خبط تھا۔
اک دم کال بیل بجی۔ باجی نے بڑی کاہلی سے لیٹے ہی لیٹے کہا
''پیاری شوبی! ذرا دروازہ تو کھول دے''
میں آرام کرسی میں دھنسی ناول پڑھ رہی تھی، بیزاری سے بولی۔
''خود ہی اٹھ جایئے نا؟''
''میری پیاری بہن نہیں ہے تو؟''
میں نے ذرا بشاشت سے انہیں دیکھا اور بولی
''اچھا تو جو بھی چیز دروازے پر ملے وہ میری ہی ہو

جائے گی"

وہ شرارت سے ہنس کر بولیں

"اچھا اچھا بھابی تو دروازہ تو کھول، دروازے میں جو بھی ہے وہ تیرا ہے"

میں ساڑی کا پلو سنبھالتی ہوئی گئی اور دھیرے سے دروازہ کھول دیا۔

اک دم میں چونک پڑی، جتنی آہستگی سے میں نے دروازہ کھولا تھا اتنی ہی آہستگی سے میرے دل کا دروازہ بھی کھل گیا۔

میں نے سہم کر، ڈر کر باجی کو دیکھا۔ وہ خود بھی بجلی کی سی پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ میرے کانوں میں باجی کے جملے گونجنے لگے۔

"دروازے میں جو بھی ہے وہ تیرا ہے!"

میرا دل چاہا دھیرے سے جھک کر، یوں جیسے موسم بہار کی چاندنی راتوں میں ایک ہلکے سے جھونکے سے پھول آپس میں جھک کر سرگوشی کرتے ہیں پوچھوں

"دروازے میں کھڑے ہونے والے اجنبی، کیا تم میرے ہو؟"

مگر دوسرے ہی لمحہ میں اپنی اس حماقت پر شرمندہ ہو گئی۔

برسات کا پانی قطرہ قطرہ ہو کر اس کے سانولے چہرے

سے ٹپک رہا تھا۔

سفید قمیص کی آستینیں بھیگ کر اس کے بازوؤں سے چمٹ گئی تھیں، ماتھے پر بکھر آنے والے بال ننھے ننھے بھنوروں کی شکل میں اس کی پیشانی پر پیچ و تاب کھا رہے تھے، میں نے یہ سب کچھ کتنی دیر تک دیکھا، کتنے جگ بیت گئے، وہ کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"میں اندر آجاؤں ؟"

میں گھبرا کر راستے سے ہٹ گئی۔

"آجایئے نا !"

الفاظ میری لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے جانے کیسے نکلے، اور میں اپنی ساری قوت جمع کر کے کرسی پر آگری میں نے بات بنھانے کو ناول اٹھا لیا۔ مگر سیاہ حروف ناچ ناچ کر جیسے اعلان کرنے لگے۔

"دروازے میں جو بھی ہے وہ تیرا ہے"

"دروازے میں جو بھی ہے وہ تیرا ہے"

"وہ تیرا ہے"

"وہ تیرا ہے"

میں نے بے بس ہو کر ناول پٹخ دیا۔

آنکھیں اٹھائیں تو باجی ابھی تک منہ کھولے اسے دیکھے جا رہی تھیں۔

وہ قدرے مسکرا کر بولا

"آپ دونوں یوں سراسیمہ کیوں ہیں بھئی؟ میں تو آپ کی خالہ امی کا بیٹا ہوں نا۔ اتنے بار آپ کے ہاں آچکا ہوں ——— آخر آج آپ دونوں کو کیا ہو گیا؟"

ایک دم باجی دلکشی سے ہنستی ہوئی بولیں ———

"ہوا تو کچھ بھی نہیں، بس یہ ہوا کہ آپ کے آنے سے پہلے ہم دونوں کو کیا ہو گیا؟"

"آپ کے آنے سے پہلے ہم دونوں آنس کریم کی منتظر تھیں ———"

"اور نتیجے میں میں برآمد ہو گیا، ہے نا؟"

وہ ہنس کر بولا

"نہیں!"

باجی بڑی سادگی سے بولیں۔

"یہ شوبی کی بچی دروازہ کھولنے اٹھتی ہی نہ تھی، میں نے اسے لالچ دیا کہ دروازہ میں جو بھی ہے وہ تیرا ہے۔ اور ...... اور ——— ہائے ———" وہ ہنستی ہنستی پلنگ پر گر پڑیں، کتنی عجیب بات ہے نا ———؟ گویا آپ شوبی کے ہیں!"

مجھے باجی کی حماقت پر اتنا غصہ آیا، اگر ایسی کوئی بات ہم دونوں میں ہوئی بھی تھی تو یوں ہنس ہنس کر اسے سنانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ہنس کر میری

طرف مڑا اور بولا

"ہاں جی میں آپ کا ہوں"

میں جیسے زمین میں گڑ گئی۔ ایسی بات کا بھلا کیا جواب ہو سکتا تھا۔

بہت دیر بعد میں نے نگاہیں اٹھائیں تو وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

پانی میں نہایا ہوا وہ سانولا سلونا چہرہ! اُف برسات نے اس کے چہرے پر کتنا نکھار اور حسن پیدا کر دیا تھا۔

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے آج سے پہلے میں نے عارف کو نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا بھی تھا تو ایسی نگاہوں سے کہاں دیکھا تھا؟

وہ ہمیشہ جو آتا تھا تو بھائی جان کے کمرے میں یوں ہی بیٹھا بے ہنگم قہقہے لگانے والا ایک عام سا لڑکا تھا۔ مگر آج برسات میں بھیگ کر آنے والا، سانولی رنگت اور جلتی آنکھوں والا یہ کوئی دوسرا ہی عارف تھا، جو بے نیازی سے پوچھ رہا تھا

'کیا تم میری ہو؟'

اور یوں برسات میری زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں لے آئی۔

برسات کے موسم کا وہ بادل جو عارف کو بھگو گیا

تھا میرے لئے کتنا قابلِ احترام تھا۔ اس ایک بادل نے میرے دل کے عبادت خانے کے دروازے کھول دیئے تھے۔

میں شبنم سے ایک دم پھول ہو گئی تھی۔ ہنسنے، مسکرانے والا پھول ——

اور اس رات میں نے باغ کی روشوں پر پھوار میں اپنا چہرہ اونچا کر کے گنگنا گنگنا کر بادل کو پکارا تھا۔

"اے بادل! آ میں تجھے چوم لوں، میری زندگی میں خوشیاں بھر دینے والے پانی کے قطرو! آؤ میں تمہیں اپنی آنکھوں میں بٹھا لوں ——"

کھڑکی میں سے باجی نے الجھ کر مجھے آواز دی تھی۔

"شوبی چلو کمرے میں، بھیگ کر بیمار ہو جاؤ گی اتنی رات کو کوئی یوں باغوں میں گھومتا ہے؟"

مجھے یاد ہے ایک بار میرے ہاتھ سے اتفاقاً سینٹ کی شیشی چھوٹ گئی تھی۔ اور ڈر کے مارے میں نے باجی سے یہ بات چھپا لی تھی —— اور انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا تھا۔

"تو نے یہاں سینٹ تو نہیں گرایا؟"

میں سہم کر بولی تھی۔

"نہیں تو، میں کیوں گھبرانے لگی؟"

وہ اسی انداز سے بولتی گئیں۔

"تو جھوٹ کیے بھی تو کیا ہوتا ہے، کہیں خوشبو بھی چھپی رہ سکتی ہے؟"

مجھے اب اپنی وہی حالت نظر آنے لگی۔

ان دنوں میں خود کو یوں دنیا کی ننگا ہوں سے، بچائے بچائے پھرتی، لیکن جیسے باجی ننگا ہوں ہی ننگا ہوں میں کیے جاتیں۔

"کہیں خوشبو بھی چھپی رہ سکی ہے"۔

فرق صرف اتنا تھا وہ سینٹ کی خوشبو تھی۔ یہ پیار کی خوشبو تھی، میں اپنے پیار کا راز آشکارا کرتی بھی تو کیسے؟ اگر کہیں عارف کو پتہ چل جاتا کہ میں اس سے پیار کرنے لگی ہوں تو ——؟

تو وہ کیا سوچتا؟

کیا میں بھی اس لائق تھی کہ میں بھی چاہی جاتی ——؟

مجھے اپنے مقابل ایک دم باجی کا خیال آگیا۔ سرخ و سپید، رنگت سنہرے بال، بجلیوں کی طرح رہ رہ کر چمکتی آنکھیں اور شوخ و شنگ سراپا۔

ایک میں تھی، برسات کی شاموں کی طرح سانولا رنگ، آنکھیں بڑی بڑی مگر بجھی بجھی، نم نم سی، دُبلی پتلی خاموش سی لڑکی۔ سر پر سیاہ بالوں کے

بادل دیکھ دیکھ کے مجھے اکثر خیال آتا کہ میں صرف رو ہی سکتی ہوں۔

نام بھی تو ایسا ہی کچھ تھا، شبنم۔ صورت شکل کے حسابوں میں اگر میں شام تھی تو باجی صبح، پھر بھلا کون شام کی تاریکی کو گلے لگا سکتا ہے۔ سبھی چمکیلی اور روشن صبح کو پیار کرتے ہیں۔

ظاہر ہے عارف بھی ادھر ہی جھکے گا، اور کون جانے وہ باجی کو پیار کرتا بھی ہو؛ کسی کے جی کا حال میں جان بھی کیسے سکتی ہوں؟

عارف آتا تو باجی ہنستی مسکراتی اس سے باتیں کرتیں۔ بھائی جان کے ساتھ مل کر اس سے بیٹھی گھنٹوں لڑا کرتی تھیں۔

بیڈمنٹن، کیرم، تاش کھیلتیں، اور یہ سب کچھ ہو جاتا تو بیت بازی پر تل جاتیں۔ ایسے میں کبھی ساتھیوں کی کمی پڑتی تو مجھے بلایا جاتا۔

مجھے اس ماحول میں اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا۔ سب کے قہقہے سن سن کر میرا جی ڈوبنے لگتا۔ میرے سانولے چہرے پر غم کی چھاپ گہری ہونے لگتی۔

ایسے میں کوئی نہ کوئی کہہ اٹھتا

"بھئی شوبی! سچ مچ تم ہماری بہن نہیں لگتیں"

الگ الگ یہ بات نہ صرف ہر بھائی بہن نے بلکہ

امی اور ابو تک نے کہہ دی تھی کہ میں ان کی بیٹی نہیں سجتی۔ قسمت کی یہ خوبی ہی تو تھی کہ جہاں سب بہن بھائی چاند ستاروں کا دوسرا روپ تھے، میں برسات کی رات تھی۔ قسمت کے لحاظ سے بھی اور صورت کے لحاظ سے بھی!

ایسے میں میرا جی چاہتا کہ سب سے الگ تھلگ رہوں، جہاں کوئی مجھے میری سانولی رنگت کا طعنہ نہ دے سکے۔ جہاں میری کبھی کبھی آنکھوں کو اُلاہنے نہ دیئے جا سکیں، کوئی یہ نہ کہے کہ اس کی شکل کتنی رونی ہے۔

عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ جسے وہ چاہتی ہے وہ بھی اس کی ہنسی اڑائے محبت کا جواب محبت سے نہ ملے تو عورت عورت نہیں، ناگن بن جاتی ہے۔

مجھے یہ کب پتہ تھا کہ عارف مجھے چاہتا ہے یا نہیں۔ لیکن میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ وہ جانے نہ جانے، لیکن مجھے اُلاہنے نہ دے، میری ہنسی نہ اُڑائے۔ اسی لئے میں ہر لمحہ دنیا والوں کی نگاہوں سے دور رہنا چاہتی۔

ایسے میں ایک دن جب عارف نے بیت بازی میں یہ شعر پڑھا ؎

ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انہی سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

تو مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے میری آنکھیں مجسم آگ

بن گئی ہیں۔

ہر لحہ بجھی بجھی رہنے والی آنکھوں نے چنگاریوں کا روپ دھار لیا ہے۔ اور وہی چنگاریاں اڑ اڑ کر عارف کے دل تک پہنچ رہی ہیں، اور اسے بولنے پر مجبور کر رہی ہیں ع

آنکھیں زباں نہیں ہیں، مگر بے زباں نہیں

میں سر کے درد کا بہانہ کر کے اک دم وہاں سے اٹھ بھاگی جب باہر نکلتے نکلتے میں نے پلٹ کر دیکھا تو باجی حیرت سے عارف کو دیکھ رہی تھیں جو کسی کا خیال کئے بغیر مجھی کو دیکھ رہی تھیں جو کسی کا خیال کئے بغیر مجھی کو گھورے جا رہا تھا۔

یہ میری زندگی کا وہ سنہرا دور تھا جب پہلی بار کسی نے مجھ پر پیار کی نظر ڈالی۔ میری سنجیدگی میں اور بھی ٹھہراؤ آگیا مجھے اس بوجھ کے سنبھالنے میں اور بھی دکھی ہو جانا پڑا۔ کیا سچ میں اس لائق تھی؟

پھر دن یوں سر سر گزرنے لگے جیسے پروائی ہوا کے جھونکے ایک شام کو بارش تھم گئی تھی۔

سارے میں پانی ہی پانی تھا۔

کہیں بہتا ہوا ــــــ کہیں رکا ہوا، بچے کاغذ کی ناؤ اور کشتیاں بنائے پانی میں چھپاکے اڑا رہے تھے۔ باجی نے منو کے ہاتھ سے ایک ناؤ لی اور ہنستی ہوئی پانی میں اتر گئیں۔

ناؤ کو بہا کر بولیں۔

"دیکھوں تو کہاں ڈوبتی ہے؟"

عارف بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔
مجھے پورچ میں کھڑی دیکھ کر بولا
"شوبی، تم بھی آ کر کھیلو نا؟"
"میں ــــ؟"
میں گھبرا کر، پھر اک دم ہنس کر بولی "میں
کوئی بچی ہوں؟"
عارف برجستہ بولا
"تو گویا تمہاری باجی تو بچی ہیں نا؟"
باجی اس بات پر ذرا الجھ کر بولیں۔
"یہ تو سدا کی روتی ہے۔ کبھی کسی بات میں دلچسپی نہیں
لیتی، پانی سے کیا کھیلے گی یہ؟"
عارف نے بڑی سادگی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا
تھا۔
"آؤ تو سہی!"
میں نے لرز کر عارف کو دیکھا
بس دیکھ ہی کر رہ گئی، کہتی بھی کیا۔
اتنے میں عارف نے میرے نام سے ایک ناؤ بنائی
اور اسے پانی میں ڈال کر بولا
"شوبی آنکھیں بند کر لو، اگر اس گلاب کے پودے
تک تمہاری ناؤ پہنچ گئی تو سمجھو سب کچھ ٹھیک ہے،
ورنہ....."

"ورنہ کیا ــــــ؟"

میں بے تابی سے بولی۔

"ورنہ تمہاری ناؤ بس ڈوبی ہی سمجھو"

وہ ہنس کر بولا

وہ ہنس رہا تھا تو مجھے بھی ہنسنا پڑا، لیکن جانے کیوں میرا جی رہ رہ کر کانپ رہا تھا۔

میری بند پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں، کہ اک دم یہی چیخ کر بولی۔

"شوبی باجی کی ناؤ مسرت باجی نے ڈبو دی!"

میں نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔

باجی وہاں سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔

عارف سنجیدگی سے بولا

"ہاں مسرت تم نے یہ ناؤ ڈبوئی"

باجی پیروں سے چھپا کے اڑاتے ہوئے بولیں۔ ہ

"چھی، ان کھیلوں میں کیا رکھا ہے ــــــ وہی کہیں کے"

اور وہ اپنی ساڑی پنڈلیوں تک اٹھائے بجلیاں گراتی چلی گئیں، میں نے بڑے دکھ سے عارف کو، دیکھا۔

- عارف نے مجھے دیکھا اور بے بسی سے آنکھیں، جھکا لیں۔

تو یوں میری زندگی کی ناؤ باجی نے ڈبو دی   عارف

تم نے یہ کھیل کیوں کھیلا   کیوں   کیوں

کیوں   میں اپنے آپ میں گم رہتی، مذاق

مذاق میں جیسے کسی نے میرا جی لوٹ لیا تھا   یہ سب کیا تھا؟

ننھی سی روشنی جو میری تاریک زندگی میں چھوٹے سے آگئی تھی کہیں منہ نہ موڑ لے۔

میں مسرت کی اس ننھی سی شمع کو مضبوطی سے تھامے دھیرے دھیرے زندگی کی طرف بڑھنے لگی۔

زندگی میں وہ پہلا موقعہ تھا جب میں نے اپنی، سال گرہ دھوم دھام سے منانے کے بارے میں سوچا سبھی بہن بھائیوں کی سال گرہیں بڑے دھوم دھڑکے سے ہوا کرتی تھیں،

مگر میں کسی ہنگامے کو روا نہ رکھتی، اب کے برس میرا جی امنگوں سے بھرپور تھا، میں بڑے انہماک اور دلچسپیوں سے اپنا لباس تیار کرنے لگی میں نے دیکھا تھا، عارف کو نیلا رنگ بہت پسند تھا، میں نے چپکے سے اپنے دل سے صلاح کی اور نیلا لباس تیار کرنے لگی۔

ایک صبح میں بیٹھی اپنے لباس پہ ستارے ٹانک

رہی تھی کہ باجی آگئیں اور مجھ سے پوچھنے لگیں کہ میں کس سلسلے میں یہ لباس تیار کر رہی ہوں جب میں نے سال گرہ کی بات سنائی تو وہ ہنس کر بولیں۔

"میری سنتی ہے تو سیاہ لباس خوب رہے گا"۔

"سیاہ لباس، اور سال گرہ پر!" میں لرز کر بولی "کہیں دیکھا نہ سنا، سیاہ لباس تو ماتمی موقعوں کے لئے ہوتا ہے"۔

وہ جاتے جاتے بولیں،

"میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ عارف کو سیاہ رنگ پسند ہے!"

عارف کو سیاہ رنگ پسند ہے! پھر تو مجھے سیاہ لباس ہی پہننا چاہئے، میں نے طے کر لیا اور نیلے کو، ادھورا چھوڑ دیا۔

سال گرہ قریب آرہی تھی، میں بہت مشغول رہتی تھی، ایک دن میں سیاہ ریشم پر سرخ دھاگے سے پھول بنا رہی تھی کہ عارف آگیا، مجھے مصروف دیکھ کر وہ رکا تو نہیں، یونہی کہنے لگا۔

"تم مجھ سے ناراض تو نہیں شوبی؟"

میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا

"تم سے؟ ـــــ نہیں تو ـــــ کیوں ـــــ؟"

وہ پیچھے مڑا، کچھ کہنے کو ہوا، پھر ذرا دکھ سے

مسکرا کر یوں ہی چلا گیا۔

میرے دل میں پھانس سی پڑ گئی

سال گرہ کے دن بڑا ہنگامہ تھا۔ مہمان بھرے پڑے تھے اک دم باہر سے کوئی مجھے پوچھتا ہوا آیا۔

"شبنم بی بی کہاں ہیں؟"

عارف شرارت سے بولا

"وہ ـــ جہاں بہت روشنی ہو رہی ہے نا ـــ وہاں!"

میں نے شرما کر دیکھا۔ کتنی عجیب بات کہی عارف نے۔ بھلا جہاں میں رہوں وہاں روشنی ہو سکتی ہے؟

میں نے باجی کو مخاطب کیا۔

"باجی! سنی آپ نے عارف کی بات؟"

باجی چڑ کر بولیں۔

"ہاں بہت دنوں سے سن رہی ہوں، آج کوئی نئی بات تو نہیں کہی"

میں دم بخود رہ گئی

'باجی مجھ سے ناراض کیوں ہیں؟' یہی خیال رہ رہ کر دل میں کچوکے لگاتا رہا

میز کے آس پاس سب کھڑے تھے، میں نے اٹھارہ موم بتیاں روشن کیں

اک دم عارف بولا

"بجھانے سے پہلے دل میں کوئی اچھی سی دعا یاد کر لو"

میں ہنس کر بولی

"اس سے کیا ہوگا؟"

عارف حیرت سے بولا

"ارے پاگل لڑکی، وش نہیں کرو گی؟ یہی وقت تو ایسا ہوتا ہے جب اللہ میاں دعائیں سن لیتے ہیں"۔

میں جھکی، اٹھارہ شمعوں کا اجالا میرے چہرے پر چھلکا، اور میں نے ارمانوں بھری دعا مانگی۔

"میرے خدا! میری خوشیوں کی ناؤ کبھی نہ ڈوبے!"

فنکشن ختم ہوئے بعد جب سب ادھر ادھر بکھر گئے تو عارف ایک لمحہ کو میرے پاس آیا اور بس اتنا ہی بولا

"مجھے تم سے امید نہ تھی کہ ایسے موقعے پر ماتمی لباس پہنو گی"۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ بولا

"پہلے اس لئے نہ کہا کہ یوں تمہاری خوشی ذرا کرکری ہو جاتی، آخر تم اتنی غم پسند کیوں ہو؟"

وہ جھک کر بولا

"مسکرانا سیکھو میری گڑیا! مسکراہٹ ہی تو، زندگی ہے۔"

مگر خوشیوں کا بار مجھ سے نہ سنبھل سکا اور اس بوجھ کو سنبھالتے سنبھالتے میں بالکل ہی خاموش سی رہ گئی۔ عارف آتا تو میں اسے یوں دیکھتی کہ بس چلتا تو بس اپنی آنکھوں چھپا لیتی

کبھی اس کے سامنے میری زبان نہ کھل سکی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا، زبان کھولوں گی تو طاقت جواب دے جائے گی، میری زندگی میری آنکھوں میں سمٹ کر آگئی تھی۔

میں کیسے کہہ دیتی کہ میں تمہیں کتنا چاہتی ہوں۔

میری زندگی کا مقصد بس یہی تھا کہ تمہیں چاہتی رہوں دیکھتی رہوں۔

زبان کھولتی تو شاید میں میں نہ رہ جاتی، میری عبادت کا سارا زور ٹوٹ جاتا۔ میں جو تمہارا اتنا احترام کرتی تھی کیسے اس بے ادبی کی متحمل ہو سکتی تھی عرفی!!

کچھ دن یونہی عبادت کرتے گزر گئے، انہی دنوں عارف خالہ امی کے ساتھ لکھنؤ چلا گیا۔ اور میں نے اپنی کاپی کے ایک کونے میں محبت کی وہ مختصر داستان پڑھی تھی جو لاکھ صفحات پر بھاری تھی۔

اٹھ کر تو آگئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

میں نے دنیا پالی۔

میری زبان جو آگے ہی خاموش تھی بالکل ہی خاموش ہو گئی۔

میں نے سوچا، دنیا کا وہ کتنا عظیم مفکر تھا جس نے کہا تھا "محبت میں ایک وقت وہ آتا ہے جب خاموشی ہی

گویائی ہو جاتی ہے۔"

اب میں خاموش رہتی تھی، مگر میرا انگ انگ بولتا تھا ـــــــ !

عارف لکھنؤ سے آیا تو میں نے ایک بات آزمائی کہ وہ اب رہ رہ کر مجھے کچھ اجنبی نگاہوں سے دیکھتا تھا، میں اسے اپنی طرف دیکھتے پاتی تو آنکھیں آپ ہی آپ جھک جاتیں۔ اقرارِ محبت کی اس سے حسین ادا اور کون ہو سکتی تھی، لیکن شاید عارف اس سے کچھ مطمئن نہ تھا۔

وہ مرد تھا اور منہ سے کہلوانے کا خواہش مند تھا ایک دن باغ میں مجھے تنہا دیکھ کر بولا

"شوبی! تم نے سنا ہوگا میں انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا۔ اور سلیکٹ بھی کر لیا گیا ہوں اور اب پروفیسر ہو رہا ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ خموش ہو گیا

میں نے خوشی سے تمتماتا ہوا چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بولتا گیا۔

"ظاہر ہے اب میں تنہا نہیں رہنا چاہوں گا، اگر میں تمہارے لئے ابّو سے بات کر دوں تو ؟"

ہوائیں میرے کانوں میں نغمے بکھیرنے لگیں، اور میں کیا سن سکتی تھی۔

ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر بھاگ آئی۔

راستے میں باجی ملیں، خوشی سے دمکتا میرا چہرہ دیکھ کر

نہوں نے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ جہاں میں ابھی ابھی عارف کو چھوڑ
ئی تھی۔

وہ منہ سے تو کچھ نہ بولیں، اداس چہرہ لئے دھیرے
دھیرے عارف کی طرف بڑھنے لگیں۔

میرے دن اور راتیں خوشی میں گذرنے لگیں، اب میں اس
دن کی منتظر تھی جب میرے آنگن میں شہنائی بجتی، اور آنکھوں
میں آنسو، مگر دل میں خوشی کے طوفان چھپائے میں عارف
کے گھر جاتی، چھوٹا سا گھر، جہاں بس میں اور عارف ہوتے
اور خوشیاں ہوتیں،

"میری خوشیوں کو کوئی چرا نہ لے، نظر نہ لگا دے"،
میں یہی سوچے جاتی اور اپنی ان سہانی امانتوں کو سنبھالنے
کی کوشش میں الگ تھلگ اور خاموش رہتی۔

مجھے نہیں معلوم زندگی کی اس دوڑ میں مجھ سے کہاں، کونسی
بھول ہوئی کہ زندگی سچ مچ برسات بن کر رہ گئی۔

وہ چاند کی گیارھویں تاریخ تھی آسمان پر جھجھاتا چاند
تھا۔ اور نیچے لان میں ہم سب۔

کریم نے کبھی ٹرے میں ڈاک لاکر رکھ دی تھی، لیکن
خط ابو کے نام تھے۔ اس لئے اور کسی نے نہیں کھولے،
تھے ـــــ!

ابو آئے تو حسبِ عادت زور زور سے خط پڑھنے لگے۔
ابو کی عادت تھی خط کو یوں پڑھتے جیسے گنگنا رہے ہوں، کسی کی

سمجھ میں تو نہ آتے۔ مگر وہ زور زور سے گن گن کئے جاتے، آخر میں انھوں نے ایک خط ختم کیا اور امی سے مخاطب ہو کر خوشی خوشی بولے۔

"تو بھئی اب تمہاری کیا رائے ہے، ہم تو اس رشتے سے بہت خوش ہیں"

"کس کا رشتہ؟ کیسی رائے؟"

امی ذرا الجھ کر بولیں۔

"ارے بھئی اپنی مسرت کے لئے عارف کا رشتہ آیا ہے نا"

گیارھویں کا چاند دھیرے دھیرے سیاہ بادلوں میں چھپ گیا۔ اور میرے دل کا چاند بھی سدا کے لئے ڈوب گیا۔

اب عارف کی حیثیت ایک منگیتر کی ہو گئی تھی۔ اس لئے اب اس نے ہمارے ہاں آنا چھوڑ دیا تھا۔ اور ہمارے گھر میں شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔

تقدیر کا یہ اتنا بڑا ستم تھا کہ میں کسی سے گلہ تک بھی نہ کر سکی، میں نے کسی سے کچھ نہ کہا، خود اپنے آپ سے بھی نہ پوچھا کہ آخر عارف اتنا بدل کیوں گیا۔

میں شادی کی تیاریوں میں سب سے پیش پیش رہتی کہ کہیں لوگ یہ نہ کہنے لگیں یہ کیسی بہن ہے۔ جو اپنی سگی بہن سے بھی یوں ناخوش ہے۔

معلوم ہوتا تھا دنوں کے پیروں میں زنجیریں پڑ گئی ہیں جو وقت پر لگا کر اڑتا تھا، اب یوں گھٹنے لگا تھا جیسے پیر زخمی

ہوں۔

آخر شادی کا دن بھی آگیا، میں نے نہایت بے دلی سے ایک سفید لباس تیار کیا تھا۔ وہی پہنا بھی تھا۔

عارف دُولہا بن کر میری آنکھوں کے سامنے باجی کو بیاہ لے جانے آیا۔ اور میں سب کچھ دیکھتی رہی۔

آنکھیں برسات برساتی رہیں اور میں اوپری دل سے مسکراتی رہی، عارف نے مجھ سے کوئی بات نہ کی، بس ایک بار اتنا پوچھا۔

"ارے یہ سفید لباس اور اپنی بہن کی شادی میں! جانتی ہو سفید لباس بیوائیں پہنتی ہیں!"

میں اپنے دل کا، اپنی زندگی کا سارا درد سمیٹ کر بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"میں بھی تو کنواری بیوہ ہوں"

لیکن میں اپنی بات کا ردِ عمل دیکھنے کے لئے عارف کے چہرے کو نہ دیکھ سکی، کیونکہ اسی لمحہ میری آنکھوں سے برسات شروع ہو گئی تھی۔

شادی کے ہنگامے بھی ختم ہو گئے،

میں گھائل ہرنی بنی بن بن دل کا چین کھوجتی پھری، لیکن دل کی ویرانی اور دُکھ کا مداوا کہیں نہ ملا۔

باجی کو لے کر عارف کو لکھنؤ جانا تھا، سروس جوائن کرنی تھی، باجی اپنی روانگی کی تیاریوں میں رہتیں اور میں دیوانوں

کی طرح کونے میں منہ چھپائے بیٹھی رہتی، اور روتی رہتی۔ ایک دن عارف نہ جانے کیسے مجھے تنہا پاکر باغ میں چلا آیا۔

اس نے مجھے دیکھا۔

جیسے ہمت سمیٹی اور دکھ سے بولا

"شبنم! یہ میری زندگی تھی، میرا مقدر، مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں،

مگر تم یہ تو سوچتیں کہ ایک پیار بھرے دل کے سامنے روپیہ پیسہ کیا حقیقت رکھتا ہے؟

تم نے مسرت کے سامنے یہ کہا تھا نا کہ تم عارف ایسے حقیر اور غریب پر دفیسر سے کبھی شادی نہیں کرو گی ـــــ!

میں تمہارے لئے دعا کروں گا کہ خدا تمہیں اتنا امیر شوہر دے جو تمہیں سونے کے برابر تول دے"۔

میرا سر گھومنے لگا اور دنیا چکر کھاتی محسوس ہونے لگی۔ میں نے تڑپ کر عارف کی طرف دیکھا۔

"یہ سب تم کیا کہہ رہے، کیا کہہ رہے ہو عارف؟"

لیکن وہ کہے جا رہا تھا۔

"میں آتا تو تم خاموش ہو جاتیں، مجھے جس بات سے دکھ پہنچتا، وہی کرتیں۔ سالگرہ کے دن تم نے جان بوجھ کر سیاہ لباس پہنا، حالانکہ تم جانتی ہو مجھے سیاہ رنگ سے دلی نفرت ہے، تم مجھ سے چھپاتی رہیں، لیکن مسرت نے مجھ سے ہر ہر بات کہہ دی۔ تب میں نے سوچا، بہت برا ہوگا اگر میں زبردستی تم سے

پیار کئے جاؤں، تمہیں بیاہ لے جاؤں، لیکن اب بھی یہ تڑپتا دل تمہیں یہی دعا دے گا کہ تم عمر بھر خوش رہو،،

میں دھم سے زمین پر گر پڑی

مجھے ماضی کی ہر ہر بات، ہر ہر لمحہ یاد آنے لگا۔

آہ ــــ! محبت کا تیر ہم دو نوں بہنوں کے دل میں ایک ساتھ چبھا۔!

اور باجی نے عارف کو جیتنے کی خاطر۔۔۔۔

لیکن ــ!

وہ بھی تو مجبور تھیں۔

اب عارف کے سامنے سب کچھ دہرانے سے فائدہ بھی کیا ہو گا۔

زندگی کی ہر ہر خوشی تو ــــــ آنسوؤں کی برسات میں بہہ گئی ہے۔

میری بزم سونی رہ گئی ہے عارف؛

تم دل میں ہو مگر ــــ پھر بھی مجھ سے، کتنی دُور ــــ؟

تم کس دل سے چلے گئے عارف!

اور کچھ نہیں تو اس برسات ہی کا خیال کیا ہوتا جس نے شوبی کی زندگی کی خوشیوں کو ــــ ختم کر کے رکھ دیا ہے!

اُف ــ ....؛

جانے والا بزم سے اٹھ کر چلا گیا،
مگر ....،
برسات کی ہر پھوار پر ، قدموں کی ہر آہٹ پر
کانوں میں یہی گونج آتی ہے ۔
" دروازے پر جو بھی ہے وہ تیرا ہے !"
جب تک .... !
میری آنکھوں میں برسات کی ـــــــ نمی
موجود ہے .... ؛
میرے دل کو یہ یقین ہے ؛
کہ ....،
تم میرے ہو ؛
صرف میرے ـــ !!

ہنسی کہاں کھو گئی

خدا اور رنڈی کے گھر کے دروازے ہر کسی کے لئے کھلے ہوتے ہیں، خدا کے گھر میں کوئی بھی داخل ہو جائے وہ کسی کو نہیں دھتکارتا ——،

رنڈی بےچاری کی آغوش بھی ہر ایک کے لئے کھلی ہوتی ہے.

لیکن خدا کے گھر میں داخل ہونے کے لئے مرد، عورت بچہ، بوڑھے کی کوئی تخصیص نہیں ——؛

اور ظاہر ہے رنڈی کے پاس جانے کے لئے مرد ہونا لازمی ہے ——؛ بھلا عورت بچوں اور بوڑھوں کا ایک رنڈی کے ہاں کیا کام؟

اور سارا جھگڑا تو یہی تھا کہ میں جو ایک عورت تھی یعنی کہ عورت ہوں، مجھے ایک رنڈی کے ہاں جانے کی

سخت ضرورت آن پڑی تھی۔

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیسے اور کس بہانہ سے جاؤں ؟

ویسے یہ بات قطعاً نہ تھی کہ مجھے کوئی رنڈی میسر نہ تھی بمبئی جیسی بستی، یہاں پیشہ ور عورت کی بھلا کون کمی ہے؟ ایک ڈھونڈو ہزار مل جائیں ــــــ!

میرے گھر کے آس پاس ہی کتنی عورتیں کھلے بندوں بھی، اور چوری چکاری سے بھی، یہ دھندہ چلاتی تھیں، لیکن بہانہ ؟؟

میں کیا بہانہ ڈھونڈتی ؟

اپنے میاں سے میں نے ذکر کیا کہ میں کسی رنڈی سے ملنا چاہتی ہوں، تو وہ دیدے پھاڑ کر چلاتے۔

"تم... !... تم کسی پیشہ ور عورت کے گھر جاؤ گی ؟"

"کیوں، اس میں اتنا چیخنے چلانے کی اور حیرت کرنے کی کون بات ہے، کیا وہ انسان نہیں ہوتیں ؟"

"ارے ہوتی ہیں بابا..... لیکن شریف عورتیں ایسی جگہوں پر جانے کے بارے میں سوچتی تک بھی نہیں ہیں اگر کسی نے دیکھ لیا تو ؟"

"دیکھ لے گا تو میرا کیا بگاڑے گا، اور میں کون سے ایسے جنسی تقاضوں سے مجبور ہو کر جا رہی ہوں... مجھے تو بس ایک اسکیچ بنانا ہے"

"اسکیچ ۱"

وہ جلبلا اٹھے ــــ "اور اگر اسکیچ بنانا ہی ہے تو ایک رنڈی ہی کا کیوں! وہ تو کسی کا بھی بنایا جا سکتا ہے"۔

"ارے بھئی آپ نہیں سمجھیں گے، وہ جو فن مصوّری کا آل انڈیا مقابلہ ہو رہا ہے کے نہیں، اس کے لئے میں چاہتی ہوں کہ ایک ایسی نادر، انمول اور اچھوتی تصویر بناؤں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں، میں نے سوچا ہے ایک طوائف کی تصویر اسی رنگ ڈھنگ سے بناؤں، جیسی وہ رہتی ہے ــــ!

دنیا والے دیکھیں تو سہی، ایک رنڈی کی زندگی کیا ہوتی ہے وہ کیسے رہتی بستی ہے۔

اس کی زندگی میں جو کرب ہوتا ہے، میں رنگوں کے ذریعہ اس کے چہرے پر اجاگر کرنا چاہتی ہوں"۔

"بڑی سخت مصیبت ہے"۔

وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بولے "آرٹسٹ خواتین سے نباہ بڑی مشکل ہے"۔

میں جل گئی

"آپ خواہ مخواہ خود کو اہمیت نہ دیجیئے..... میں یہ کام آپ کے بغیر بھی کر سکتی ہوں، پیشہ کرنے والی عورت، اپنے ہر ہر انداز سے پہچانی جاتی ہے، میں ایک آدھ دن کسی کے گھر میں بھی گھس جاؤں گی"۔

وہ کچھ نہ بولے،

اب میں انہیں کیا سمجھاتی کہ میں کتنا بڑا، اور کتنا اہم کام کرنے جا رہی ہوں،

مرد اور عورت کے سوچنے کا انداز کتنا الگ الگ ہوتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ مجھے نہ تو اس مقابلے میں ملنے والے ایک ہزار روپے کی لالچ تھی نہ نام نمود کی، نہ شہرت کی، میں بس صرف اتنا چاہتی تھی کہ میں عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی "یونِک" چیز پیش کروں، ایسی کہ جو بھی دیکھے ایک لمحہ کو سہی ٹھٹھک کر رہ جائے۔

میں نے طے کر لیا کہ مجھے ہر حال میں ایک طوائف کی زندگی پیش کرنی ہے ..... اور یہ بھی سوچ لیا کہ میں کہاں جاؤں گی۔

میرے گھر کے قریب بہت تو نہیں، لیکن تھوڑے فاصلے پر میں نے چند گھر اور ان گھروں کی خواتین دیکھی تھیں جو چہرے مہرے سے صاف پہچانی جاتی ہیں کہ وہ کون ہیں، ان کے چہرے چلتے پھرتے اشتہار تھے کہ ہاں ہم بکنے والی چیز ہیں۔

اتنا تو خیر میں بھی جانتی ہی تھی کہ رنڈیوں کا "کاروبار" رات کو چلتا ہے دن میں وہ خالی ہوتی ہیں، مگر دن چڑھے تک سوتی ہیں، مطلب یہ کہ گیارہ بارہ بجے سے پہلے ان کے ہاں جانا حماقت ہی ہے۔ دوپہر کے وقت ٹھیک رہے گا، میں

نے طے کر لیا۔

اس دن لنچ کے دقفہ میں آئے ہوئے مہمان کو کھلا کر بچوں کو اسکول روانہ کر کے میں بھی ایک بیگ میں، اپنا ضروری سامان رکھ کر ایک ٹیکسی کر کے اپنی منزل تک پہنچ گئی۔

ٹیکسی رکنے کی آواز کے ساتھ اندر سے ایک آواز آئی۔

"جنّو، جا کر دیکھ تو کس کے دروازے پر ٹیکسی رکی ہے۔؟"

اور اس آواز کے ساتھ ہی چار پانچ سال کا ایک دبلا پتلا سا بچہ دروازے پر نمودار ہوا۔

اپنے دروازے پر ٹیکسی کھڑی دیکھ کر قدرے فخر اور خوشی کے جذبات سے مغلوب، اندر بھاگ گیا۔ ٹیکسی کا بل ادا کر کے میں دروازہ تک کچھ جھجکتی ہوئی پہنچی ہی تھی کہ اندر سے ایک عورت نکلی۔ مجھے کئی کئی بار، بے حد غور اور حیرت سے دیکھنے کے بعد وہ کچھ اٹکتے رکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آپ..... آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

میری کچھ ہمت بندھی، مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔

"آپ ہی سے"

"مجھ سے...!"

اس نے اپنے سینے پر انگلی ٹکا کر بے حد غیر یقینی لہجے میں کہا۔

"مجھ سے!"

"جی ہاں۔"

اب کی بار میں ذرا جی کھول کر مسکرائی۔

"کیوں آپ کو یقین نہیں آتا"

اور میں نے کچھ اس انداز سے قدم بڑھائے کہ وہ ذرا ہٹ کر مجھے اندر داخل ہونے کے لئے راستہ دے دے۔

مگر وہ تصویر حیرت بنی ابھی تک یونہی کھڑی تھی بڑے تذبذب کے ساتھ وہ بالآخر اتنا بولی۔

"مگر آپ — آپ عورت ہو کر ...."

اب میں نے سوچا کہ اسے خواہ مخواہ سسپنس میں رکھ کر کوئی فائدہ نہیں اس لئے میں صاف صاف بولی۔

"مجھے دراصل آپ کی ایک تصویر بنانی ہے، مجھے پتہ ہے کہ آپ لوگ بہت مصروف رہتی ہیں (میں نے لفظ مصروف پر خاص طور سے زور دیا) لیکن میں آپ کا کوئی نقصان نہیں کروں گی — ویسے آپ کا جو بھی ریٹ ہوگا..... میں اس سے کچھ زیادہ ہی دوں گی"

اس نے جھٹ سے زبان کھولی "میں ایک رات میں

بیس روپے ہی کمالیتی ہوں۔"

میں نے پرس کھول کر اسے چالیس روپے پیشگی گن دیئے۔ کیونکہ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ رنڈیاں اپنی رقم ہمیشہ پہلے ہی لے لیتی ہیں۔

کوئی گاہک اپنا کام کر کے چلتا بنے تو بعد میں عورت کر ہی کیا سکتی ہے۔

بہر حال میرا سلسلہ کچھ اور طرح کا تھا۔ لیکن میں خواہ مخواہ اسے غلط فہمی کا شکار کیوں بننے دیتی۔

چالیس روپے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، وہ غیر یقینی انداز سے کبھی روپوں کو اور کبھی مجھ کو دیکھتی رہی۔

پھر جیسے جاگ کر بولی

"ارے بی بی، آپ اندر تو آیئے"

اس کی آواز میں ہنسی گھلی ہوئی تھی، میں اس کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوئی۔

گھر ——— ؟ گھر اسے کہنا میری دریا دلی ہے، ورنہ اس میں گھر جیسی کیا بات تھی۔

سڑا، مارا کمرہ جس میں الگنی ڈال کر دو چار لنگی، نائلون اور سستے ریشم کی ساڑیاں لٹکائی ہوئی تھیں۔ ایک بوسیدہ سا نواڑ کا پلنگ، اس کے نیچے ایک صندوق پلنگ سے لگ کر ایک میز، جس کی ایک ٹانگ کو سہارا

دے کر اینٹ کے ذریعہ باقی تین ٹانگوں سے جوڑ کر سنگار میز کا درجہ دیا گیا تھا۔

اس پر پاؤڈر، ایک دو لپ اسٹک، کاجل کی کجلوٹی تیل اور اسی قسم کی بلا بتر رکھی ہوئی تھیں۔

اسی کمرے کے ساتھ اسی چھوٹی سی جگہ میں کچھ برتن۔ بھانڈے اس جگہ کے کچن ہونے کا اعلان کر رہے تھے بے دھلے چند برتن، دو چار رکابیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں،

چولہا مٹی کا بنا ہوا تھا۔ جس میں چند ادھ بجھے کوئلے کبھی کبھی دہک جاتے ہانڈی کی خوشبو سے اندازہ ہوا کہ ارہر کی دال ابل رہی ہے۔

اس نے جو اس قدر غور سے مجھے حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھا تو کچھ شرمندہ سی ہو کر ایک رسی پر جھولتا ہوا ملگجا سا پردہ کھر سے کھینچ دیا۔ اور نادم سی بولی۔

"میں ابھی ابھی اٹھی ہوں، گھر بھی صاف نہیں کیا آپ بیٹھئے تو"

پھر خود ہی بے حد صاف دلی سے کہنے لگی۔

"اصل میں رات کو میں نے کئی دنوں بعد چار چار گاہکوں کو نپٹایا ہے اسی لئے بہت تھک گئی تھی"

میں نے دہل کر اسے دیکھا۔

رنڈی پن کی گہری چھاپ ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر یہ تاثر کہیں نہیں تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔

"اتنی تھکن میں صبح ہی اٹھ کر صفائی دھلائی اور کھانے، پکانے پر کون دھیان دیتا ہے ــــ !

اسی لئے جب چار پیسے زیادہ بن جاتے ہیں تو میں تو ہوٹل ہی سے کھانا منگوا لیتی ہوں۔ انسان آخر اپنے آرام کے لئے ہی تو پیسے کماتا ہے،،

وہ پھر مسکرائی

میں جواباً مسکرا نہ سکی

ایک عجیب سی گھٹن کا احساس مجھے وہاں بیٹھے ہو رہا تھا۔ ــــ افلاس ــــ افلاس ــــ کمرے کی ہر ہر چیز پر افلاس کی شدید چھاپ تھی۔

میں نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا کہ یہ بدنصیب عورت رات بھر میں بمشکل چار، پانچ روپے بناتی ہوگی۔

بہرحال میں یہاں غم کھانے نہیں آئی تھی، میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بج رہے تھے، میں نے نرمی سے اسے سمجھانا شروع کیا۔

"دیکھو......،، میں رکی "تمہارا نام ؟"

"میرا نام تو ویسے عائشہ ہے، آپ چاہیں تو آشا کہہ سکتی

ہیں۔ میرے نام سے مجھے بڑا فائدہ ہوتا ہے، ہندو گاہک آیا تو مجھے آشا سمجھ لیتا ہے، اور مسلمان ہو تو عائشہ، اصل میں عائشہ اور آشا سننے میں ایک سے ہی لگتے ہیں نا ۔۔۔؟"

وہ مسکرائی

"لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"ارے بی بی بہت فرق پڑتا ہے"

وہ بڑے بے تکلفی سے ہنسی

"بعض گاہک ایسا سرپھرا ہوتا ہے کہ چلا تو ہے وہ عیاشی اور گناہ کرنے، مگر مذہب سر پر سوار ضرور رہے گا،

وہ تو یہی چاہے گا ۔۔۔۔ اپنی ذات کی عورت کے ساتھ ہی سوئے،

ایسے میں میرا نام مجھے فائدہ دے جاتا ہے، ویسے مجھے نام سے کیا غرض، ۔۔۔ اپنے کام سے کام اور دام، سے مطلب!"

اس کی باتوں سے گھبرا کر میں نے سانس لی۔ اور اس سے بولی۔

"اچھا تو عائشہ، تم پندرہ بیس منٹ کے لئے اس پلنگڑی پر جوں کی توں بیٹھ جاؤ، مجھے تمہاری تصویر بنانی ہے ۔۔۔ ہلنا جلنا نہیں، بس جیسی بیٹھی ہو، بیٹھی رہو

رہو۔"

"کنگھی نہ کر لوں، بال تو جھاڑ جھنکاڑ سے ہو رہے ہیں۔"

"ارے نانانا، سنگار پٹار کی ضرورت نہیں"

"کمرہ صاف کر لوں۔؟"

وہ پھر بولی۔

میں نے کہا "نا۔! مجھے ہر چیز اسی طرح چاہیئے، تم بھی، تمہارا کمرہ بھی، تمہارا سامان بھی"

اصل چیز اور ماحول بیک گراؤنڈ ہی تو تھا، جس سے چہرے کا کرب اور تاثر گہرے سے گہرا کر سکتی تھی۔

"کم سے کم ساڑی بدلنے دیجئے بی بی، دیکھئے تو کیسی گنجل گئی ہے۔"

"دیکھو، عائشہ!"

میں نے اسے سمجھایا

"مجھے تمہاری یہ تصویر ایک میلے میں بھجوانی ہے، اور تصویر کی ساری خوبی اس کی سادگی میں ہوگی، اس لئے تم سجنے دھجنے کے چکر میں نہ پڑو، بس چند منٹ کے لئے چپکی بیٹھی رہو ——"

"چپکی" وہ چلائی —— نانا بی بی، میری تصویر چپکی نہ بنانا۔ ہنستی ہوئی بنانا، آپ کو پتہ ہے، ایک عورت —— میرا مطلب ہے مجھ جیسی پیشہ ور عورت کے لئے مسکراہٹ

کتنی ضروری ہوتی ہے۔ چہرے پر ہنسی نہ ہو تو گاہک بھی لات مار کر چلا جائے گا۔!

ارے بی بی کوئی اپنا پیسہ خرچ کرے گا تو اس لئے نا کہ دو گھڑی جی بھی خوش ہو، روتی بصورتی صورت سے کوئی مرد پیار کرے گا....

اسی لئے تو اپنے دکھ سہہ کر بھی میں نے کبھی اپنی مسکراہٹ نہیں کھوئی۔ مجھے تو یاد بھی نہیں کہ زندگی میں میں کبھی ایک منٹ کو بھی اپنی ہنسی سے بچھڑی ہوں، آپ کو ایک بات سناؤں....

ہوں تو میں دبلی پتلی سی عورت! ایسی عورت میں مرد کے لئے کیا ہوتا ہے کچھ بھی تو نہیں،

بعض جگہوں پر تو عورت کو مرد کے لئے ابھرا بھرا ہونا ہی چاہیئے۔ میرے ساتھ بھی یہی مصیبت تھی بی بی، سو آپ جانیں،

میں نے ربر کے کیس والی چولی پہننی شروع کر دی۔ اس سے کچھ تو ابھار میرے میں پیدا ہوا۔ لیکن ایک رات ایک گاہک نے جذبات میں آکر جب مجھے دبوچنا شروع کیا تو مجھ میں کیا خاک دھرا تھا۔ بس میری ربر کی چولی اس کے ہاتھ میں آگئی۔

کوئی اور عورت ہوتی تو ایسی اپنی دردناک ذلت پر رو رو مر جاتی۔ میں تو ہنسے ہی گئی، ورنہ وہ تو یوں ہی

میرے پہلو سے اٹھ کر چلا جاتا۔ ایک اچھی عورت کا کام ہے کہ مرد اسکے پاس سے خوش خوش جائے،،

"اُفوہ عائشہ، تم کسقدر باتونی ہو،،

میں نے دل ہی دل میں گھبرا کر سوچا۔ بولی کچھ نہیں پتہ نہیں بے چاری کو اپنا دل ہلکا کرنے کیلئے کتنے دنوں بعد ایک ساتھی جڑا تھا۔

موضوع بدلنے کو میں بولی

" تم بمبئی کی تو نہیں معلوم ہوتیں،،

" نہیں، میں یوپی سائڈ کی ہوں، اب تو بمبئی میں رہتے رہتے اپنی بات چیت پر بھی یہیں کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ ویسے شہر بدلنے سے قسمت تھوڑی بدل جاتی ہے بی بی، میری قسمت میں صرف جسم بیچنا تھا سو جہاں بھی رہو نگی بیچتی رہوں گی،،

"اچھا عائشہ، اب تو پلنگ پر اس طرح بیٹھو کے تمہارا جسم پوری طرح میری نظروں کی زد میں رہے، لیکن خود، تمہاری آنکھیں مجھ پر مرکوز نہ ہوں،،

اسی دم وہی چھوٹا سا لڑکا جو اتنی دیر سے جنے کہاں غائب ہو گیا تھا، آن ٹپکا۔

" اماں مجھے بھوک لگی ہے روٹی دو "

میں نے حیرت سے عائشہ کو دیکھا۔ " یہ ـــ یہ تمہارا بچہ ہے؟"

"ہاں، بی بی جی ـــــ!" وہ پلنگ پر سے پھدک سے کود ی۔

"رنڈی کو اولاد خدا نہ دے، اور جو دے تو پھر لڑکی دے کہ بڑھاپے کا آسرا ہو ....

یہ کمبخت مارا پیدا ہو کر ہی رہا، حالاں کہ میں نے پیٹ گرانے کی کتنی دوائیں گرم ٹھنڈی کھائیں کہ کوئی جیسا، غیرت دار ہوتا تو پانی بن کر نکل جاتا۔ لے مرے ـــ"

اس نے اسی رو میں ہانڈی میں سے دال الٹ کر ایک رکابی اس کے سامنے پٹخی، اور جانے کب کی سوکھی ماری ایک روٹی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

میں بے بسی سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہی تھی ـــ

"عائشہ مجھے صرف آدھ گھنٹہ سلیقے سے بخش دو،" میں نے دل ہی دل میں التجا کی، منہ سے نہ کہہ پائی۔

"اب جلدی سے کھا اور مر چک"

بچہ منمنایا

"دال میں نمک نہیں ہے اور روٹی کتنی کرکری ہو رہی ہے ـــ"

"ہاں، تیرے باپ نے تو ہوٹل کھول رکھی ہے ناکہ تازہ بہ تازہ آئے گا، جو بھی ہے جلدی سے کھا اور غائب ہو!"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو گئی ۔

"ارے بی بی ، اس حرامی سے بھی میرے کام میں اس قدر حرجہ پڑتا ہے ! کوئی کوئی ضرورت کا مارا دن میں بھی آجاتا ہے ۔ تو یہ موا ٹلتا ہی نہیں ، جب تک کہ دس پانچ پیسہ ہاتھ پر نہ دھر دے ۔"

"منگائی اس غضب کی ، اس سوئر کے جننے کے لئے کہاں سے دس پیسہ روز لاؤں "

" تم تو کہتی تھیں میں روز آنہ بیس کما ہی لیتی ہوں "

میں نے کہنا چاہا لیکن خاموش رہ گئی ۔

مصلحتاً بے چاری نے کہا ہو گا ۔ ورنہ وہ تو اس کے حال چلنے اور رہن سہن سے ہی ظاہر تھا کہ کیا کماتی ہو گی اور کیا گنواتی ہو گی ۔

ابھی دم دوا نگل کی انگنائی میں سے ہوتا ہوا ایک مسٹنڈا سیدھا وہیں چلا آیا جہاں ہم دونوں بیٹھے تھے ، اور بے اِتہا لاپرواہی سے بولا ۔

" اری او عائشہ ، دلاری کے پاس گاہک آیا تھا ، لیکن آج اس کو تیسرا ہی دن تھا ۔ تو نپٹ لے ــــ "

اور جیسے آیا تھا ویسے ہی چلتا بنا ۔

اس کے جاتے ہی ایک اور مرد گھر میں داخل ہوا ، میں لرز اٹھی ۔

" اللہ ــــ ! میں بھی یہ کس مصیبت میں پھنس گئی

آج ــــ !"

میری موجودگی سے بے نیاز عائشہ خوشی سے جھومتی ہوئی اٹھی، بچے کے سر پر پہلے تو ایک ٹھونگ ماری، کھانا جلدی ختم کرنے کے لئے ایک گالی سے نوازا، اور پھر میرے پاس آکر بڑی لجاجت سے بولی۔

"آپ تو بی بی جی بڑی اچھی ہیں، جہاں اتنی دیر ٹھہریں تھوڑی دیر اور سہی، یہ ہمارا پرانا گاہک ہے۔ اس کی بیوی بڑی لڑاکا ہے،

رات کو دیر سے گھر جائے تو مارنے سے کبھی نہیں چوکتی اس لئے اکثر بے چارہ دن میں ہی چلا آتا ہے۔ بس دس منٹ لوں گی، اتنے میں آپ کو انگنائی میں کرسی ڈال کر بٹھا دیتی ہوں، برا نہ مانئے گا"

"ہیں، پھر کل وَل آؤں گی"

میں گھبرا کر بولی ــــ،

یا ان صاحب سے کہہ سکو تو کہہ دو کہ کل یا کبھی اور تشریف لا سکیں تو لے آئیں"

"ارے بی بی، مرد ذات کو جب 'بھوک' لگ آئے تو وہ کل وَل کی راہ نہیں تکتا، وہ اب ٹلنے والا نہیں، آپ کو کیسے ناں بولوں، بس چند منٹ"

اور وہ کھٹاک سے پردے کے پیچھے غائب ہو گئی

ــــ !

چند منٹ بعد اس نے سر نکال کر جھانکا۔ اب وہ پکی طوائف نظر آ رہی تھی۔

پاؤڈر، لپ اسٹک، کاجل، مسی، یعنی ہر ہر چیز کا اس نے بافراط استعمال کیا تھا۔ اور چہرے پر ہنسی بکھیرے آواز دے رہی تھی۔

"اے مہمان جلدی کرو، مجھے اور بھی کام ہیں"،

چنو کو اس نے ایک دھپ مار کر اٹھایا۔ اور پانچ پیسے کا سکہ پکڑا کر دروازے سے باہر کر دیا۔

میں نے زندگی میں کبھی اتنی پریشانی محسوس نہیں کی تھی وہ تو اچھا ہوا کہ میری اسکیچ بک میرے پاس تھی،

میں بیٹھی آڑی، ترچھی لکیریں کھینچتی رہی ورنہ اللہ جانے میرا کیا حشر ہو جاتا۔

چند منٹ خاموشی سے گزرے، پھر لڑنے بھڑنے جیسی آوازیں آنے لگیں۔

عائشہ اونچے لہجہ میں بول رہی تھی۔

"ارے تیری گرہ سے تو کچھ نہیں جاتا، بس ریلوے اسٹیشن پر بیٹھے بابو لوگ کی کتابیں دستخط کرو، اور جتنے چاہے اٹھا لاؤ، اس میں بھی تیری جان نکلتی ہے"،

"تو تو خود ہی کیوں نہیں لے آتی"،

مرد بھی چڑ گیا۔

"ارے واہ وہ کوئی عورتوں کے استعمال کی چیز ہے۔ جو وہ بابو مجھے دیدے گا"۔

"تو پھر مول خرید کر لے آیا کر"۔

"اور جو تو ہی لے آیا کرے تو؟ پندرہ پیسے میں تین تو ملتے ہیں، کچھ تیرا تو نہیں چلا جاتا پندرہ پیسوں میں!" وہ تڑخ کر بولی۔

مرد نے کھن کر کے پندرہ پیسے کے سکے فرش پر اچھالے، اور پتلون سنبھالتا ہوا باہر چلا گیا۔

عائشہ پھر میرے پاس آ بیٹھی اور معذرت کے سے لہجہ میں بولی۔

"بی بی جی، اب قسم سے کوئی ہرجہ نہیں ہوگا۔"

لیکن اسی لمحہ چنتو پھر روتا ہوا آن مرا، اب کی بار وہ غبارہ کی ضد لگائے ہوئے تھا۔

عائشہ پھر سے اٹھ کر اندر لپکی، تھوڑی دیر میں وہ سفید پنی میں لپٹا ہوا ایک غبارہ لے آئی،

ہونٹوں سے لگا کر اس نے جو زور سے پھونک ماری تو وہ سفید ربر کا غبارہ پھولتا ہی گیا، اور پھولتے پھولتے تربوز جتنا بڑا ہو گیا۔

"فیملی پلاننگ زندہ باد"!

میں نے دل ہی دل میں سوچا

پھر وہ ایک دھاگہ لائی اور اس نے اس کا منہ کس

کر باندھ دیا۔

اور چنو کو ڈانٹ کر بولی۔

"اب چھوڑا تو دوسرا نہیں دوں گی! یاد رکھنا، مفت نہیں ملتا۔ پانچ پیسے میں ایک آتا ہے سمجھا حرامی"

پھر وہ میری طرف دیکھ کر ہنسی،

"ویسے پانچ پیسے کا بھی ہے تو میری گرہ سے کیا جاتا ہے میں نے تو اپنے ہر گاہک سے بات پکی کی ہوئی ہے کہ جو بھی میرے پاس آئے گا دس بارہ نرودھ ضرور لا کر دے گا"

وہ بیحد خوش دلی سے ہنسی،

"اور کیا بی بی جی، بازار سے رنگین غبارہ لو تو سوا پندرہ پیسے سے کم کا نہیں ملتا، اور اتنے چھوٹے کے بس خدا حکومت کا بھلا کرے،

میری ساتھ والیوں کے سبھی کے بچے انہیں غباروں سے کھیلتے ہیں"،

میں نے اپنے آپ کو کوسا۔

"اگر تصویر بنانے کے چکر میں نہ پڑتی تو کون سی افتاد آن پڑتی، اب تو بری طرح کھب گئی تھی۔

اسے شاید میری بات یاد تھی ۔ "ایک منٹ" کہہ کر گئی اور کنگھی لگا کر، پوڈر، لپ اسٹک پونچھ پانچھ کر وہ پھر پہلے جیسی عائشہ بن کر میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی میری کرسی اس نے پہلی والی جگہ پر رکھ دی تھی اور کہنے

لگی۔

"بس اب میں بالکل نہیں بولوں گی بی بی، مگر تصویر بس مسکراتی ہوئی بنائیے۔"

"ٹھیک ہے"

میں مرے دل سے بولی، وہ تو مسکرا رہی تھی، مگر میرا دل بڑا الجھا الجھا سا تھا، کم سے کم وہ خوشی بالکل مفقود ہو چکی تھی۔ جو کسی فن کار کے دل میں کسی تخلیق کو ابھارتے ہوئے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

بہرحال میں جلدی جلدی پنسل چلانے لگی، میں نے سوچ لیا تھا، اس ماحول میں کیا خاک رنگ آمیزی ہوگی، بس یہ ہے کہ اسکیچ بنا لوں گھر جا کر اطمینان سے من چاہے رنگ بھروں گی۔

مگر عائشہ! وہ بولے بنا رہ سکتی تھی! آپ ہی آپ پھر بک بک کرنے لگی۔

"حرامزادہ صرف دو ہی روپے پکڑا کر چلتا بنا، میں نے سوچا تھا پرانا گاہک ہے، کاہے کو پیشگی کا مطالبہ کروں، مگر مطلب پورا ہوتے ہی حرامی سٹک گیا۔"

"عائشہ پلیز ......"

میں نے اسے بڑی منت سے دیکھا۔ وہ حسب عادت مسکرا رہی تھی

میں نے غور سے اسے پہلی بار جیسی دیکھا۔

کھلتا ہوا رنگ، گھنے گھنے سیدھے بال، کافی بڑی اور روشن آنکھیں، تیکھی سی ناک، بانس کی کھپچی سا چپکا ہوا جسم، لیکن سب سے نمایاں چیز ہنسی اور مسکراہٹ میں ڈوبے ہوئے لس لس کرتے دو ہونٹ اگر کوئی دل سے نیچے کوئی اسے نہ دیکھے تو اس صورت اور مسکراہٹ پر قربان ہو جائے۔

عائشہ جھوٹ نہیں کہتی تھی۔ اس کا سارا مول اس ہنسی میں ہی پوشیدہ تھا، جو اس نے کڑے حالات میں بھی کبھی نہیں بیچی، کبھی نہیں کھوئی۔

واقعی اس مسکراہٹ کو کاغذ پر بھی زندہ رہنا ہی چاہیئے۔

میں پورے انہماک سے ہونٹ بنانے لگی۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد میں نے سر اٹھایا، جیسے بڑے بوجھ سے مجھے چھٹکارہ ملا ہو۔

"عائشہ! یہ میرے لئے چند منٹوں کا کام ہے، لیکن تم نے میرے کتنے گھنٹے ضائع کئے"۔

وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ "چلئے آپ کا کام تو نپٹ لیا، مگر ایک نظر مجھے بھی تو دکھا دیجئے"۔

اور اس نے میرے ہاتھ سے اسکیچ بک لے لی۔

لیکن ایک دم اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہنے والے چہرے کا سارا انداز ہی دوسرا ہو گیا وہ

پھینی۔

"میں نے آپ سے آگے ہی کہا تھا بی کہ سب کرنا لیکن میری صورت ہنستی ہوئی بنانا، آپ کو پتہ بھی ہے کہ ہنسی کا کیا مول ہوتا ہے، اب آگے کسی نے میری بگڑی صورت اور بھنچے ہوئے ہونٹ دیکھے تو میرے دھندے کا کیا ہوگا آپ تو جب سے آئی ہیں مجھے ہنستا ہوا دیکھ رہی ہیں، پھر آپ نے میری ہنسی کہاں کھو دی۔ ؟" اور اس نے جھلا کر اسکیچ زور سے پٹخ دی۔

میں نے مرے مرے ہاتھوں سے اسکیچ بک اٹھائی اور جھک کر غور سے دیکھنے لگی،

واقعی عائشہ تو ہمیشہ مسکراتی رہنے والی ایک ہنسی کا نام تھا۔ پھر میں نے ایسی تصویر کیسے بنا ڈالی، لیکن ایک اچھی بھلی ہنستی صورت کو اجاڑنے میں کیا واقعی میرا ہاتھ تھا۔ ؟ میں نے تو یہ مسکراہٹ نہیں چھینی، پھر میں کسے دوش دوں ؟

کوئلہ بھئی نہ راکھ

رات تاریک ہے ـــــ میرے نصیب کی طرح ـــــ آسمان پر اکادکا ستارے ٹمٹمارہے ہیں۔ ان کا میرے آنسوؤں سے کیا مقابلہ ـــ؟

میری آنکھوں میں تو ان گنت ستارے جھلملا رہے ہیں، جھلملاتے ہی رہتے ہیں ـــــ

کتنے دن ہوگئے میری آنکھوں نے مسکرانا چھوڑ دیا ـــــ؟ ایسا معلوم ہوتا ہے ہنسی سے میری شناسائی ہی نہیں ـــــ

آج صبح سے میرا دل ہے کہ ڈوبا جارہا ہے، یوں رہ رہ کر تو میرا دل کبھی نہ دھڑکا تھا ـــــ مٹی کے اس ننھے منے چراغ میں ایسی کیا بات تھی کہ اس کے ٹوٹتے ہی میرا

اپنا دل بھی جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا! میں نے کتنے جتن سے، کتنے برسوں سے اس چراغ کو سنبھال سنبھال کر رکھا تھا ——
ایسا معلوم ہوتا اس چراغ سے میری اپنی زندگی کا گہرا ناطہ ہے، وہ ٹوٹے گا تو میں بھی ٹوٹ کر رہ جاؤں گی ——

اور آج —— ؟ آج تو جیسے میرا سبھی کچھ ٹوٹ گیا، سبھی کچھ لٹ گیا۔

لیکن میں بھی کیسی پاگل ہوں آفتاب —— جو یہ کہہ رہی ہوں کہ آج میرا سب کچھ لٹ گیا۔ میرا تو اسی دن سب کچھ لٹ گیا تھا جس دن تم مجھے چھوڑ گئے تھے۔

امیدوں، آرزوؤں، اور بھروسوں کے سارے چراغ تو اسی دن بجھ گئے تھے، یہ تو میں ہی تھی جو خزاں ہو کر بھی بہار بہار کرتی رہی۔

کتنی پاگل —— ؟ کیسی نادان (محبت کرنے والے سچ مچ پاگل ہی تو ہوتے ہیں!) میں تم سے شکایت نہیں کہہ رہی ہوں آفتاب —— !

شکایت اور گلے تو اپنوں سے کیے جاتے ہیں اور تم نے یہ موقع ہی کب دیا کہ میں تمہیں اپنا کہوں یا سمجھوں —— سوائے چند لمحوں کے دھوکے جو میری زندگی کا حاصل بن کر رہ گئے ہیں! کاش میں نے یوں ٹوٹ کر کسی کو چاہا نہ ہوتا۔ لیکن! کیا محبت سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے آفتاب —— ؟

اب سوچتی ہوں تو یہ سراسر پاگل پن ہی نظر آتا ہے

میں نے دل بھی کس سے لگانے کی کوشش کی ــــــ؟
تم سے! تم جو سچ مچ آفتاب ہی کی طرح بلند اور دور تھے

!

لیکن آفتاب میں سچ کہتی ہوں تم نے مجھے یوں حوصلہ نہ دلایا ہوتا تو شاید میں کبھی تمہاری طرف دیکھ بھی نہ پاتی میں نے تو جبھی سے روشنی حاصل کی تھی (اور تمہیں نے مجھے اندھیروں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا ــــــ کیسا دکھ ہے یہ!)

کتنے سارے سال گزر گئے ہیں کہ میں نے کبھی تمہارے بارے میں سوچا تک نہیں ــــــ اور جو دیکھو تو زندگی میں تمہارے سوا اور دوسری کوئی بات ہی نہیں
جیسے اپنے آپ سے۔ خود کو بچاتی چھپاتی پھرتی ہوں۔ آئینے میں خود کو دیکھتی تک نہیں کہ اپنی صورت دیکھوں گی تو تم یاد آجاؤ گے۔

اس صورت کو تم نے کتنا پیار کیا تھا، کتنا پیار دیا تھا، کتنا غرور بخشا تھا۔ ان دنوں آئینے کے سامنے جاتی تو گالوں پہ گلال سا بکھر جاتا تھا، اپنا آپا سنبھلتا نہیں تھا۔

آنکھوں کی جوت دیوالی کے چراغوں کی طرح جگمگاتی تھی مجھے میرا ماتھا چاند معلوم ہوتا تھا اور ہونٹوں پہ ایسی کلیوں کا گمان ہوتا تھا جو اب کھلیں، اب کھلیں۔

اُن دنوں کوئی مجھ سے میرا نام پوچھتا تو میں جھجک سی

آتی تھی، میں کیسے کہوں میرا نام شمع ہے۔ شمع تو جلتی رہتی ہے اور میں تو مسکراہٹوں سے عبارت ہوں۔ بھرپور بہاروں اور دلکش سپنوں سے میرا وجود لہکا مہکا ہوا ہے۔

لیکن میں یہ بھولتی ہوں کہ شمع کا کام بہر حال جلنا ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں آفتاب کہ اگر میرا نام شمع نہ ہوتا تو کیا واقعی میری زندگی یوں نہ ہوتی؟

لیکن تمہارا نام بھی تو آفتاب ہے، سورج بھی تو سدا جلتا ہی رہتا ہے، پھر تمہارے حصّہ میں دنیا زمانے کی خوشیاں کیسے ہوئیں۔ اور میں کیوں غموں سے سجائی گئی ہوں ——؟

شاید یہ میرے اپنے سوچنے کا غلط انداز ہی ہو، ہم عورتیں وہمی ہوا کرتی ہیں نا! ہاں یہ میرا وہم ہی تو تھا کہ میں ایک، معمولی سے مٹی کے چراغ کو یوں دل سمجھ کر سنبھال سنبھال کر رکھتی رہی۔

اور آج اس کے ٹوٹ جانے سے یوں اداس ہوں جیسے ساری خوشیوں ہی سے میرا ناطہ ٹوٹ گیا ہے۔ شاید یہ بات ہو آفتاب کہ اس دن تم نے ہنسی ہی ہنسی میں بہت گہری بات کہدی تھی۔

"شمع اسے سنبھال کر رکھنا، جس دن یہ بجھا سمجھو اپنی محبت بھی بجھ گئی"

وہ دیوالی کی رات تھی —— تمہیں تو یاد بھی نہ ہوگا

(اور میری تو زندگی ہی محض یاد ہے) گھر کے بچے پڑوسیوں کی دیکھا دیکھی مٹی کے چھوٹے چھوٹے دیے کہیں سے لے آئے تھے اور چاندنی کی منڈیر پر دور بہ قطار در قطار بہت سارے دیے جلا کر رکھ دیئے تھے۔ ہم دونوں چاندنی پر آئے تو سب سے کونے والا دیا بجھا پڑا تھا۔

"ہائے غریب کا کوئی پرسان حال نہیں!"

میں نے لرز کر کہا اور اسے ساتھ والے دیئے سے جلانے کو جھکی ہی تھی کہ تم نے ہنس کر کہا۔

"آج اس دیئے سے زیادہ کوئی خوش نصیب نہیں ہے —"

میں نے بوکھلا کر تمہیں دیکھا تو تم اسی جگمگاتی ہنسی کے ساتھ بولے تھے۔

"ہاں جسے تم چھولو!"

میں نے تمہاری بات کاٹ کر پوچھا۔

"اور جسے تم چھولو —؟"

دیا میرے ہاتھ میں کانپ رہا تھا —— جھل بل —— جھل بل ——

مجھے نہیں معلوم لیکن یقیناً میرے چہرے پر اس دیئے کی لو جاگی ہوگی، یقیناً اس کے عکس نے میرے چہرے کو وہ جلا بخشی ہوتی کہ تم میری تمنا کر سکو، اسی لئے تم

"شمع ـــــ میں ساری زندگی تمہاری تمنا کرتا رہوں گا ـــــ!"

میرا ہاتھ کانپا، یقیناً دیا گر جاتا اگر تم میرا ہاتھ نہ تھام لیتے (وہ ہاتھ جو پھر تم نے کبھی نہ تھاما) اور تم نے جذبات سے بھری اور بھرّائی آواز سے کہا۔

"شمع، اس مٹی کے چراغ کو میں اپنی محبت کا امین بنا لوں ـــــ؟؟"

میں وہموں کی ماری ـــــ عورت پن کی ساری کمزوریوں سمیت تمہاری طرف تکنے لگی ـــــ نہ جانے اب تم کیا کہو ـــــ اور تم نے دھیرے سے کہا تھا

"شمع اسے سنبھال کر رکھنا، جس دن یہ بجھا سمجھو اپنی محبت بھی بجھ گئی ـــــ"

میرا دل دھڑدھڑ کرنے لگا، محبت کا یہ کون سا انداز تھا کہ لے کے ایک چراغ کو تمام تر ذمہ داریاں سونپ دیں لیکن میں نے کہا نا میں وہموں کی ماری تھی۔

تمہارے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے لئے جیسے آسمانی صحیفہ ہو گئے۔

مجھے سہما ہوا دیکھ کر تم ذرا مسکرائے تھے اور کہا تھا۔

"اتنی ڈری ہوئی کیوں ہو شمع ـــــ؟"

میں اک دم بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی ـــــ "تم نے کیسی زنجیریں جکڑ دیا ہے آفتاب

—— چراغ تو چراغ ہی ہوتا ہے کبھی ایک جھونکے سے بھی بجھ سکتا ہے، اب تو ہر لمحہ میرا دل رہ رہ کر دھڑکا کرے گا، اللہ نہ کرے، اللہ نہ کرے.... جو یہ بجھے —— اور جو کبھی ہوا کا کوئی سرکش اور حاسد جھونکا، میرے آنچل سے نظر بچا کر اسے بجھا بجھا دے تو میں کہاں جی سکوں گی ——؟؟"

تم کتنی اعتماد سے بھری ہنسی ہنسے تھے

"تو تم اتنی سیریس ہو گئیں شمع —— ؛ کیا مٹی کا یہ حقیر سا دیا میری محبت پہ بھاری ہو سکتا ہے۔"

"بات مٹی اور کانچ کی نہیں آفتاب —— بات تو اعتقاد اور رواجوں کی ہوتی ہے، کانچ کی چوڑیوں میں کیا دھرا ہوتا ہے۔؟

لیکن کسی کے نام کے ساتھ جب —— ایک نئی بیاہتا کو پہنائی جاتی ہیں تو اس کی زندگی کا مول ہو جاتی ہیں —— اور پھر وہ ساری زندگی اس کے اپنے انگ کا ایک حصہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ تم نے تو یونہی ایک بات کہدی، لیکن میں تو مٹ کر رہ گئی آفتاب!"

پھر وہ رات کبھی نہ آئی، جب ہم ساتھ ساتھ چاندنی پر جاتے ——

میں چراغ جلاتی، تم میری تمنا کرتے اور میں تمہاری وفاؤں پر بھروسہ کرتی —— بس زندگی جیسے سمٹ کر آنچل کی اوٹ میں آگئی، میں نے ا... ...ے کے ایک محفوظ

طاقچے میں وہ چراغ اٹھا کر رکھ دیا۔

اور زندگی اس جتن میں گذرنے لگی کہ محبت کا وہ شعلہ کبھی بجھ نہ پائے، میرا بھولا پن دیکھو، مارے وہم کے میں ایک ساتھ دو دو بتیاں روئی کی بنا کر اس میں ڈال دیتی کہ ایسا نہ نہ ہو کہ کچا کمزور پا کر اسے بجھا ہی دے۔

ہر روز میں اس میں تیل ڈالتی، میں تو اپنا خون بھی اس میں ڈال دیتی اگر مجھے یہ یقین ہو جاتا کہ اس طرح محبت کے چراغ دل کے خون سے امر ہو جاتے ہیں۔

سب میں اس چراغ کا چرچا ہو گیا ——— میری سہیلیاں مجھ پر ہنستیں ——

"ارے دیکھو یہ زرتشتوں کی طرح دن رات چراغ جلائے رہتی ہے!"

دو ایک نے ٹوہ لینے کی کوشش کی، لیکن جس طرح منہ بند کلی کی خوشبو اسی کے تن میں چھپی ہوتی ہے، ایسے ہی اپنی محبت کا راز میں نے بھی اپنے تن من میں ہی رکھا تھا ——— !

زمانہ بہت حاسد ہے، کون جانے کس کا دل کب پلٹ جائے، اور بعض ہوائیں اتنی سرکش اور منہ زور ہوتی ہیں ——— !

اور میری محبت کا چراغ تو اتنا ننھا سا ہے.....

منزل سامنے ہو تو راستے کی کٹھنائیاں ہیچ ہو جاتی ہیں۔

میری منزل تو میرے سامنے تھی، مجھے کس بات کا ڈر تھا کانٹوں سے میں کبھی نہ ڈری ـــــ پاؤں کے چھالوں نے مجھے ہراساں نہیں کیا،

قدم قدم ـــــ، لمحہ لمحہ ـــــ، بڑھتے ہوئے حوصلوں کو زمانے کے ظلم بھی نہ پیس سکے ـــــ حالانکہ میری زندگی ہی کیا تھی ـــــ!

غریب سی لڑکی جس نے ماں کا سُکھ دیکھا نہ باپ کی محبت خالہ کے رحم وکرم کے سہارے جس نے جینا سیکھا، دو وقت کی روٹی اور تن بھر کپڑا ـــــ؛ جہاں زندگی کی معراج تھی۔ اور وقت گذارنے کے لیے جہاں ڈھیروں کام تھے ـــــ

گھر بھر کے میلے کپڑوں کے انبار؛ باورچی خانے میں چھوٹے بڑے برتنوں کے ڈھیر، جھاڑنے کے لئے بڑے بڑے آنگن، صفائی کے لیے چھوٹے بڑے کئی کمرے، اور خدمت بجالانے کے لئے چھوٹے بڑے گھر بھر کے کئی کئی آقا ـــــ

لیکن پیار کی اک نگاہ ـــــ محبت کا ایک اَن کہا بول ـــــ مٹی کا ایک چھوٹا سا دیا ـــــ یہ سب تیز جھلستی ہوئی دھوپ کو کیسے خنک چھاؤں سے بدل دیتے ہیں ـــــ؟؟

اُس دن دوپہر میں سب کو کھلا پلا کر، ہر کام سے نبٹ کر جب میں اپنے بستر پر لیٹی تو پتہ نہیں کیا ہوا کہ گھر بھر کے

بچے آکر میرے سر ہو گئے۔

"بجیا ـــــ پلیز کہانی سنایئے!"

"ہائے اللہ! کہانی ـــــ؟ اور وہ بھی دن میں ـــــ نہیں نہیں! ـــــ ایسے تو مسافر راہ بھٹک جاتے ہیں ـــــ" میں نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں باجی ـــــ آج بڑے بچا آگئے ہیں، وہ ہمیں سرِ شام ہی بستروں میں گھسا دیتے ہیں کہ بچوں کو جلدی سو جانا چاہیئے، ـــــ تو آج ہمیں آپ دن ہی میں کہانی سنا دیجئے ـــــ"

سب کاموں سے نبٹ کر، یہ بھی تو میرا آخری کام ہوتا تھا کہ رات میں سب بچوں کو کہانیاں کہہ کر سُلادُوں ـــــ دن میں کہانیاں مجھ سے کبھی نہ کہی گئیں۔

میں نے سنا تھا دن میں کہانیاں کہو تو مسافر راستے بھول جاتے ہیں، راہ بھٹک جاتے ہیں،

میں وہموں کی ماری، میرا دل یہ سوچ کر ٹوٹا کرتا، اللہ جانے کون کس ارادے سے کس راہ جانا چاہے اور راستہ بھول بیٹھے ـــــ میں کیوں کسی کی منزل کھوٹی کردوں ـــــ؟

لیکن اس دوپہر میں بچوں نے مجھے دم نہ لینے دیا، میری ایک نہ چلنے دی۔

"دیکھئے اپیّ اگر آپ نے کہانی نہ سنائی تو ہم آفتاب

بھیا کو کہہ دیں گے۔"

تم گھر کے سب سے بڑے تھے، سب تمہارا نام لے کر ایک دوسرے کو ڈرایا کرتے۔

"آفتاب بھیا!"

میں تمہارا نام دل ہی دل میں گنگنا کر بولی۔

"میرے خدا یہ کس کا نام میری زبان پر ہے! اور میں جیسے سب کچھ بھول کر کہانی سنانے لگی۔

کسی شہزادے شہزادی کی نہیں، اسی رہتی بستی دنیا کی۔ میری تمہاری ——

لیکن آفتاب! میں نے دیکھ لیا کہنے والے غلط نہیں کہا کرتے ——، دن میں کہانیاں سنانے سے مسافر سچ مچ راستہ بھول جاتے ہیں —— اپنی منزل پاتے پاتے بھٹک جاتے ہیں۔

میں نے دن میں کہانی سنانے کی جو غلطی کی، اس کا، بھگتان آج تک بھگت رہی ہوں، سوچتی ہوں یہ کہانی میں نے شروع ہی کیوں کی تھی ——؟

اور پھر یہ ہوا کہ دم بہ دم اُس چراغ کی لَو نیچی ہوتی گئی، میں پھر بھی اسے جلانے اور جلانے کی اپنی سی کوشش کیے گئی —— لیکن دل کا لہو بھی کام نہ آیا ——!

آج دل کو تھوڑی بہت تسکین بس بیتے دنوں کو یاد

کرنے سے مل رہی ہے۔

شاید آج کے بعد میں کبھی ان دنوں کو یاد بھی نہ کر سکوں یہ کیسی عجیب بات تھی آفتاب کہ زندگی میں تم نے کبھی، کھلے بام اپنی محبت کا اعتراف کیا نہ کونے کھدروں میں سرسرگوشیاں ہی کیں ——

نگاہیں —— ! صرف تمہاری وہ بولتی ہوئی، مسکراتی ہوئی، عہد و پیمان کرتی ہوئی، ساری دشواریوں کو پیس ڈالنے کے بلند بانگ دعوے کرتی ہوئی نگاہیں ہی تو تھیں جنہوں نے مجھے تمہاری محبت کا یقین دلایا۔

مجھے آج بھی تمہارے ان جذبات پر ناز ہے کہ تم نے کبھی سطحی پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔

سمندر کی وسیع ذات کی طرح تہ ہی تہ میں تمہاری محبت کی کارفرمائیاں تھیں —— سطح خاموش پُرسکون !

کوئی کیسے سمجھ سکتا تھا کہ تم ایک غریب سی بدنصیب سی لڑکی سے اتنا بھرپور پیار کرتے ہو۔ یہ تو صرف میں تھی جو تمہاری محبت کی رازدار تھی۔

چند لمحے میری زندگی کا حاصل ہیں۔ کیسے گہرا پیار چھلک پڑتا تھا —— کبھی کبھی تمہاری چھوٹی چھوٹی، باتوں سے !

اندھیری رات میں ایک بار میں سیڑھیاں چڑھ رہی

تھی، تم اتر رہے تھے۔

میں چاپ سن کر ہی سمجھ گئی یہ تم ہو، میں نے سوچا اللہ نہ کرے تم کہیں گر نہ جاؤ ۔۔۔ اسی لئے میں نے ذرا جھجھک کر کہا تھا۔

"سنبھل کر اتریئے، اندھیرا بہت گہرا ہے"

تم نے جگمگاتی آواز میں جواب دیا تھا ۔۔۔ "تمہارے چہرے کا چاند جو ساتھ ہے!"

ایک تیز دھوپ والی دوپہری میں تم باہر سے آئے تو میرا دل رو اٹھا۔

"ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھو لیجئے کیسی سخت دھوپ سے آپ ہو کر آئے ہیں!"

"دھوپ...؟"

تم نے مسکرا کر کہا تھا....

"میں جدھر جاتا ہوں تمہاری ان لانبی زلفوں کا سایہ مجھ پر چلتا جاتا ہے!"

ایک چاندنی رات ۔۔۔

چاند کے بھرپور حسن کے مقابل تم نے میرا حقیر وجود کھڑا کیا تھا۔ اور اپنی جوان سانسوں اور مضبوط ہاتھوں کے ساتھ میرے قریب تر ہو کر، مجھے چھو کر کہا تھا۔

"چاند میں اتنا نور کہاں ہے ۔۔۔ ؟؟"

میرے دہموں کے ساتھ ساتھ زندگی میں قدم قدم پہ کیسے بھرپور بھرے سے تھے۔

آج بھی تو چہرے کا وہی چاند ہے، نہ زلفوں کی وہی عطر بیز اور ٹھنڈی گھٹائیں ہیں۔

آنکھوں کے، انتظار میں بسے ہوئے ڈبڈبے ہوئے دیئے رہیں، لیکن ایک تم نہیں ہو، اور تم کیا جانو صرف تمہارے نہ ہونے سے اس زندگی کا کیا ــــ... رنگ ہے ـــــ؟؟

میں سوچتی ہوں آفتاب! لکڑیاں کتنی خوش نصیب، ہوتی ہیں کے دھواں دھواں ہو کر راکھ ہو سکتی ہیں، ہو جاتی ہیں ـــ

میں پابن تو دھواں بنی نہ راکھ جلی ــــ لمحے لمحے کی، سنگ دل واردات میرے دل سے پوچھو اور یہ دیکھو میں بھی کیسی سخت جان تھی۔ جو زندہ رہی، زندہ ہوں!

وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتی ـــ

تم بے حد شاداں، بشاش اور بہت گہرے عزم سے میرے پاس آئے اور بولے۔

"شمع ــــ زندگی کتنی خوبصورت ہے ـــــ لیکن اس سے بھی زیادہ ایک اور خوبصورت چیز ہے ــــــ پیسہ ــــــ!"

میں سر سے پاؤں تک لرز گئی اور بری طرح چونک

کر تمہیں دیکھنے لگی۔

تم اِک دم شفاف سی، بے داغ ہنسی ہنس پڑے "گھبرا گئیں ـــــ؟ میں صرف یہ کہہ رہا تھا شمع، اب زندگی اس مقام پہ آ گئی ہے کہ میں چاہوں تو خوشی سے تمہیں اپنا لوں، مجھے بھلا کون روکے گا ـــــ؟

لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہم نے جو زندگی میں اب تک صرف دکھ اٹھائے ہیں، غریبی ہی دیکھی ہے، تو اب اس راستے کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ اپنائیں، جہاں خوشی ہو، محبت ہو اور زندگی کا ہر عیش بھی ہو۔"

میں بے حد سہمے ہوئے دل کے ساتھ سنتی رہی تھی ـــــ!

"شمع پہلے میں ذرا اپنی لائف بنا لوں ـــــ میرا مطلب ہے کچھ پیسہ جمع کر لوں، کار وار خرید لوں، پھر ٹھاٹ سے تمہیں بیاہ لے جاؤں ـــــ تمہیں بھی تو زندگی کا کچھ ـــــ حسن ملے۔"

تمہاری محبت کے بدلے میں میں نے اپنی زبان شاید رہن رکھ دی تھی۔ کبھی تمہارے سامنے ہونٹ نہ ہلا پائی لیکن جیسے میرا رواں رواں چیخ اٹھا

ـــــ مجھے پیسہ نہیں چاہیئے آفتاب، مجھے دولت کی ہوس نہیں ہے۔ مجھے صرف تمہاری محبت چاہیئے، مجھے اپنے پیارے ہاتھوں کے ہار پہنا دو، اپنے گرم گرم

ہونٹوں کا ٹیکہ میرے ماتھے پر سجا دو، میرے سہاگ اور محبت کی بس اتنی ہی مانگ ہے ــــ"

لیکن میں نے کہا ناکہ میں نے تمہارے آگے صرف اپنی آنکھیں جھکانا ہی سیکھا تھا۔

اور تم چلے گئے۔

یوں کہنے اور سننے میں کتنی معمولی سی بات لگتی ہے کہ ایک شخص کو جانا تھا اور وہ چلا گیا۔

لیکن یہ میں نے انہیں دنوں جانا کہ جگمگاتا چاند تاریک کیونکر ہو جاتا ہے، پھول اپنا حسن کیسے کھو دیتے ہیں، بہاریں خزاؤں سے کیسے بدل جاتی ہیں ــــ،

اور دھیرے دھیرے، ہنسنے مسکرانے والے ہونٹ، اپنی مسکراہٹیں آنسوؤں کو کیسے بیچ دیتے ہیں ــــ؟

اور تم سے یہ بتا دوں آفتاب کہ تم نے میری آنکھوں کے لئے جو ایک بہت پیاری اور انوکھی سی تشبیہہ دی تھی کہ میری آنکھیں دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سچے ہیرے، جگر مگر کرتے ہیرے کوٹ کر اللہ میاں نے یہ آنکھیں بنائی ہیں، تو وہی آنکھیں اپنی جگمگاہٹ کھو کر جیسے دو بجھے ہوئے چراغ بن کر رہ گئیں۔

جہاں حوصلہ ہو وہاں ارادے بھی ساتھ دیتے ہیں۔ تمہارے بے پناہ حوصلوں نے تمہیں کامیابیوں سے ہمکنار کر دیا، آج یہاں، کل وہاں ــــ تمہارا بزنس پھیلتا چلا

گیا۔ تم امیر سے امیر تر ہوتے گئے۔

خوبصورت کوٹھی، فون، فرج نوکر، چاکر، اور گاڑیاں تو یوں بدلی جانے لگیں جیسے کوئی کپڑے بدلتا ہے۔

میں بھی سب کے ساتھ نئی کوٹھی میں اٹھ آئی تھی۔ ایسی زندگی جس کا تصور انسان خوابوں میں ہی کر سکتا ہے، اب سبھی کا اور میرا مقدر تھی۔

(لیکن تم کہاں تھے ___؟)

دولت آئی تو زندگیوں میں مغربیت دخیل ہونے لگی۔ لیکن میں جس مقام پر تھی وہیں رہی ___

سورج مکھی کے معصوم اور نادان پھول کی طرح جو سدا سورج کی طرف ہی تکتا رہتا ہے۔

ایک رات سب لوگ کسی پارٹی میں گئے ہوئے تھے، فون کی گھنٹی اچانک بجنے لگی...

میں نے ہی فون اٹھایا ___ تم تھے، دہلی سے بات کر رہے تھے۔

اتنی دور سے!! میرا دل لرز اٹھا۔

"ہیلو ___ میں آفتاب بول رہا ہوں، ___ اُدھر کون ہے ___؟"

میں ڈوبتے دل سے بولی

"میں ___ میں شمع ہوں۔"

"کیا کر رہی ہو ___؟؟

"جل رہی ہوں —"

اُدھر سے ایک بھرپور ہنسی،

"اُف وہ! تم تو ڈائیلاگ بول رہی ہو!"

نہ جانے ایک سا کتنے سارے آنسو میری آنکھوں میں امڈ پڑے ——— میں نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی —،

بنتے بگڑتے جملوں کو میرے آنسوؤں نے بھگو بھگو دیا —!

"آفتاب، میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تم آتے ہو، پھر چلے جاتے ہو —، پھر آتے ہو پھر چلے جاتے ہو —،

مجھ سے بات تک کرنے کا وقت تمہارے پاس نہیں ہوتا....

یہ چہرہ آج بھی چاند ہے، آنکھیں آج بھی ہیروں کی طرح دمکتی ہیں، زلفوں میں آج بھی ساون کی گھٹائیں جھومتی ہیں، لیکن تم کہاں ہو آفتاب...."

اُدھر سے فون کٹ ہو گیا۔

تیسرے دن پلین سے تم آئے،

شوفر گاڑی لے کر ایرو ڈروم گیا تھا۔

تم نوابوں کی سی شان اور تمکنت کے ساتھ اترے، کچن کی ایک کھڑکی کاریڈور میں کھلتی تھی، تم ادھر اُدھر،

دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ جیسے کسی کو ڈھونڈ رہے ہو.... شاید تمہاری آنکھوں کو میری تلاش ہو؟

میں نے دیکھے دل سے سوچا.... لیکن تم اپ اپ کرتے اوپر چلے گئے۔ شام کو میں پودوں میں پانی دے رہی تھی کہ تم باغ میں نکل آئے۔

"ارے شمع تم ــــ مالی کہاں ہے؟ یہ تم کیا کرتی رہتی ہو ہمیشہ، کام، کام ــــ اتنے سارے نوکر جو ہیں ــ؟"

میں نے پہلی بار بے خوفی سے تمہاری آنکھوں میں جھانکا ــ

"آفتاب سبھی پھول تو ایسے نہیں ہوتے جو مالی کے ہاتھوں کھل سکیں ــــ"

اک تم چونکے؛

"تم آج کل بہت ڈائیلاگ بولتی ہو ــــ ایں، اور بھئی اس دن ٹرنک کال پر تم یہ کیا نادانی کرنے لگیں؟ کوئی ایسے کیا کرتا ہے ــــ؟ میں نے تو گھبرا کر رسیور ہی رکھ دیا۔"

میں کچھ نہ بولی.

پودوں میں پانی ڈالتی رہی.

لڑکیاں بہت احمق ہوتی ہیں زندگی بھر محبت کے پودوں میں امیدوں کا پانی ڈالتی رہتی ہیں ــــ اور

میں بھی تو ایک لڑکی ہی تھی ـــــــ سب لڑکیوں جیسی۔ بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی نادان۔

اور مجھے اس دن پر حیرت ہے جب میں اتنی بے باک ہو گئی تھی کہ تمہارے مقابلے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

یہ تمہارا احسان تھا یا ظلم پتہ نہیں،

بہر حال تم نے مجھے نت نئے کپڑوں اور زیوروں سے لاد دیا تھا۔

سبھی سے تمہارا یہ مطالبہ تھا کہ گوندنی کے پیڑ کی طرح زیوروں سے لدی رہیں۔

گھر کے لڑکے کاریں اڑائے پھرتے، لڑکیاں نئے نئے فیشن کے کپڑوں اور زیوروں سے سجی بنی کوٹھی پر اپنی سہیلیوں اور دوستوں کے ساتھ ہنگامہ مچائے رکھتیں۔

اور تم جو ان دنوں نعوذ باللہ سب کے پالن ہار بنے ہوئے تھے یہ سب دیکھ کر خوش ہوتے رہتے کہ سب لائف کو کسقدر انجوائے کر رہے ہیں۔

اور یہ دیکھ کر کڑھتے رہتے کہ میں اتنی خوشیوں کے باوجود کس طرح ـــــ بے طرح اداس رہتی ہوں، پہننے اوڑھنے سے مجھے رغبت نہیں گھومنے پھرنے کا شوق نہیں۔ آنے جانے میں دل نہیں لگتا، محفلوں سے بھاگتی ہوں ـــــ

میں کیا کرتی آفتاب ـــــ، میرا تو دل ہی جیسے

مردہ ہو گیا تھا ____،

تم سچ مچ ہی آفتاب بنکر رہ گئے تھے۔ جسے ہر لمحہ دیکھ تو سکتے ہیں، ____ ہاتھ بڑھا کر چھو نہیں سکتے۔ اپنا نہیں سکتے۔

اُس دن تم کلکتہ سے آئے ہوئے تھے۔ تم نے اپنے دوستوں کو ایک پارٹی دے ڈالی۔

انتظام تو مجھے ہی کرنا تھا۔ سو میں نے کر دیا، لیکن ان ہنگاموں سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی ____؟ تم نے مجھے جتا دیا تھا

"دیکھو شمع؛ خدا کے لئے آج ذرا اچھے کپڑے پہننا اور خوبصورت ____ خیر وہ تو تم نظر آؤ گی ہی!"

میں نے بے حد بے دلی سے وہ جوڑا پہن لیا، جس سے میری دیرینہ یادیں وابستہ تھیں۔ جن دنوں تم غریب تھے لیکن میرے تھے۔

اندھیری راتوں میں جن دنوں تم میرے چہرے کی روشنی میں اپنے راستوں کے لئے چراغ فراہم کر لیا کرتے تھے ____!

سیاہ شلوار، سیاہ قمیص اور سیاہ دوپٹہ، جس پر ستارے ٹنکے ہوئے تھے، تم کسی کام سے اندر آئے تو، تھے تو بڑی لپک جھپک میں ____ لیکن مجھے دیکھ کر ٹھٹھک سے گئے۔

"شمع ـــــ، یہ دوپٹہ ...."

میں نے تمہاری بات کاٹ دی،

"اِسے میرا مقدر سمجھ لو ـــــ سیاہ تاریک ـــ اور اِن ستاروں کو آنسو ـــــ شاید یہ نشانی تمہیں کچھ سوچنے پر اُکسائے"۔

"تم کیسی باتیں کر رہی شمع؟"

میں پھٹ پڑی۔

"آفتاب مجھے مت آزماؤ ـــــ خدا کے لئے مجھے مت آزماؤ؛ میں گھٹ رہی ہوں، مر رہی ہوں، تمہیں کچھ احساس نہیں ہوتا ـــ"۔

آنسوؤں نے میرا گلا رُندھا دیا۔

"آج میں تم سے تمہیں کو مانگتی ہوں بولو آفتاب؛؟ جب اللہ نے تمہیں دنیا جہاں کی نعمتوں سے نواز دیا ہے تو مجھے کیوں ٹال رہے ہو...."

"پاگل نہ بنو شمع ـــــ میں تمہیں ٹال دال نہیں رہا ہوں بھائی، قصّہ دراصل یہ ہے کہ ابھی میرے سامنے اتنے پروگرام ہیں کہ میں خود گڑبڑا گیا ہوں....

دیکھو، پندرہ دن بعد مجھے لندن جانا ہے، وہاں سے لوٹوں تو شاید کئی دنوں کے لئے دہلی جانا پڑ جائے۔ اگلے چھ مہینوں میں مجھے پیرس ـــ ہانگ کانگ ...."

میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، میں

پر چیخ اٹھی۔

"آفتاب، سونے کے مت بن جاؤ، خدا کے لئے گوشت پوست کے انسان بنے رہو کہ میں تمہیں پا بھی سکوں، چھو بھی سکوں اور چھو دُوں تو یہ احساس بھی کر سکوں کہ میں نے محبت اور پیار سے بھر پور ایک گداز بھرے دل کو، جسم کو چھوا ہے،۔۔۔ یہ احساس نہ ہو کہ میں نے ایک سونے کے مجسمہ کو محبت دی ہے"۔

تم ہکا بکا رہ گئے۔

شاید تمہیں توقع نہ تھی کہ میں، جو سدا ایک گونگی کے کردار میں تمہارے ڈرامے میں پارٹ کرتی رہی، یوں بول بھی، سکوں گی۔

میں اچانک دیوانوں کی طرح اٹھی اور اونچے کارنس پر سے وہ ننھا منا چراغ اٹھا لائی جو میری امیدوں کی طرح رہ رہ کر ٹمٹما رہا تھا۔

"اسے پھونک مار کر بجھا دو آفتاب ۔۔۔ اب میں زندگی سے ہار گئی ہوں، مجھ میں وہ حوصلہ نہیں کہ میں اسے دل کا خون دے کر بھی زندہ رکھ سکوں ۔۔۔"

تم نے چراغ کو بے معنی نگاہوں سے دیکھا ۔۔۔ اسے، بجھایا نہیں (لیکن جلایا بھی نہیں)

اس رات کی پارٹی کی ایک بات مجھے یاد رہ گئی ہے، تم نے اپنے دوستوں کا ہم سب بہنوں سے تعارف کروایا تھا اور

تمہاری ہی ٹکّر کے ایک بزنس مین دوست اسلم نے، مجھ سے
ہاتھ ملاتے وقت بے حد شدید حیرت اور سچائی کے ساتھ کہا تھا۔
" یار آفتاب ـــــ کیا بے وقوفی تھی ـــــ آج کے دن تک
یہی سمجھتا رہا تھا کہ حوریں مرنے کے بعد ہی ملیں گی ؟"

پھر چند دنوں بعد خالہ امی نے میرے سامنے ایک عجیب و
غریب " بات " پیش کی ،
" بیٹی ـــــ تم جانتی ہو آفتاب کتنا روشن خیال لڑکا ہے ۔
اس نے اپنی بہنوں کو بھی بے جا پابندیوں سے دور رکھا ہے اور
تمہیں بھی وہ اپنی بہنوں کی طرح ہر عیش آرام مہیا کرنا چاہتا ہے
اسلم آفتاب کا بہت گہرا بہت پیارا دوست ہے ،
اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس نے تمہیں بے حد پسند
کیا ہے ، وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے ۔"
وہ کچھ ٹھہر کر بولیں ۔
" ہم سب اور خاص طور سے آفتاب اس رشتے سے
بیحد خوش ہے "
اس کے بعد تو سننے کے لئے کچھ بھی نہ رہ گیا ۔
میں اس اصول کی قائل ہوں کہ محبت ایسا جذبہ ہے جو
زبردستی کسی سے نہیں جوڑا جاسکتا ۔ جب تمہیں نے ہی مجھے ٹھکرا
دیا تو میں تمہارے سامنے ، اس گھر میں رہ کر ہی کیا کرلیتی ـــــ

میں تو بہر حال ایک بوجھ تھی جو کسی نہ کسی کے سر لاد دیا جاتا۔
میں نے ہاں، نا کچھ بھی نہ کہا، بس اپنا سر جھکا لیا، اب میں سر اٹھا کر جی بھی کیسے سکتی تھی ___؟

لیکن یہ کیسا دکھ ہے آفتاب جو جی سے جاتا ہی نہیں، میں کہانیاں پڑھتی تھی جن میں ہمیشہ دو محبت کرنے والوں کے بیچ زمانہ، سماج یا کوئی رقیب آڑے آجاتا تھا۔

محبت اسی لئے سدا مثلث سے تعبیر کی جاتی رہی ہے، لیکن میرے نصیب میں یہ کیسا غم لکھا تھا کہ نہ تو کوئی سماج میرے لئے دیوار بنا، نہ زمانے نے اڑچن ڈالی، نہ کوئی رقیب ہی پیدا ہوا تمہیں میرے سب کچھ تھے اور تمہی نے مجھے بھری بہار میں لوٹ لیا ___؛

تمہی نے سہاگ کی بندیا میرے ماتھے پر سجائی اور تمہی نے مٹا دی ___ جیون مرن کا سارا کھیل تمہارے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچا ___؛

میں جب بیاہ کر کے نئے گھر آئی تو وہ دیا اپنے ساتھ ہی اٹھا لائی، اسلم نے دیکھا، میں دیئے کی ایسی دیوانی ہوں تو اس نے میرے گھر کو سدا دیوالی کا روپ دیدیا۔
ننھے منے رنگین قمقمے یہاں سے وہاں تک سارے لان میں، درختوں میں، حد یہ کہ ننھے منے پودوں تک میں

لگوا دیئے۔

"تمہیں اُجالوں سے پیار ہے اور مجھے تم سے....."

اور اس نے محبت سے سرشار ہو کر بے حد عام، شوہروں والی، ہزار بار کہی بات دہرائی۔

"جان یہ حقیر قمقمے ہیں، تم کہو تو میں آسمان کے سارے جگمگاتے ستارے توڑ کر تمہارے آنچل میں ڈال دوں ——"

اسلم بے چارے کو یہ بات نہیں معلوم آفتاب کہ جن، ستاروں کا توڑ لانے کا جتن وہ کرتا رہتا ہے، وہ آج سے سالوں پہلے تم نے —— چن چن کر میری آنکھوں میں بسا دیئے ہیں۔

مجھے اسلم پر کیا کیسا ترس آتا ہے۔

اُس بے چارے نے کیا تصور کیا ہے کہ اسے محبت سے محروم زندگی ملے۔

اور پھر اتنا لوٹ کر چاہنے والا شوہر....!

اسی لئے.....

آج میں نے اپنے ہاتھوں اس مٹی کے دیئے کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا....

میں ان یادوں کے لئے کیوں اپنا جیون برباد کر دوں —— جو؛ مجھے خوشی کا ایک لمحہ بھی نہیں دے سکتیں۔

لیکن صبح سے اب تک ــــ ؛ میں ایک لمحہ کو بھی ،
سکون نہیں پا سکی ہوں ؛
رہ رہ کے دل میں کانٹے سے ٹوٹ ـــــ رہے
ہیں ..... ؛
اور آنسو تو .... ؛
یوں ٹوٹ ٹوٹ گر گر رہے ہیں ، جیسے ساری
دنیا بہا لے جائیں گے ،
دل کی دکھن کا یہ عالم ہے ــــ جیسے ـــ چھالے
تپک رہے ہوں ۔
بے پناہ خوشیوں ، محبت کرنے والے ساتھی اور
رنگین بہاروں میں گھری ہونے کے باوجود جیسے میری روح
ترس ترس کر کراہتی ہے ۔
میں تنہا ہوں ـــ
میں اکیلی ہوں ـــ ، میں اکیلی ہوں ـــ ،

چاند

ساری گڑبڑ شاہد میاں نے پیدا کی، بیٹھے بٹھائے حوض میں تیرتے ہوئے پھول پر لپک پڑے اور بے چاری چاند کو مجبور کیا کہ کسی بھی طرح وہ پھول لا دے۔ جو ہوا کے ہلکوروں کے ساتھ لچکتا لچکاتا ان کے شوق کو اور تیز کر رہا تھا ــــ؛

چاند نے کنارے پر بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ لمبا کیا، مگر پھول بجائے ہاتھ میں آنے کے ایک جھونکے کے ساتھ اور دور ہو گیا اور چاند نے ذرا جو جسم آگے جھکایا تو دھڑام سے حوض کے اندر ــــ؛

چھوٹے نواب اپنی بھونڈی آواز سے کوئی عاشقانہ شعر گنگناتے ہوئے ڈیوڑھی میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک بار یونہی نظر اٹھا کر سامنے دیکھا اور بس دیکھتے ہی رہ گئے۔

چاند اپنے بالوں کا پانی نچوڑتے ہوئے کھڑی تھی، لباس

سارا کا سارا پانی میں بھیک کر بدن سے چپک کر رہ گیا تھا، اور جسم کی ہر اونچائی نیچائی یوں واضح ہو رہی تھی کہ بس! کالے کالے بالوں کی لٹیں گورے گورے گالوں پر جم گئی تھیں سانس اتھل پتھل ہو گئی تھی۔

ایسے میں چھوٹے نواب کی آواز سن کر اس نے سر اونچا کیا اور دوسرے ہی لمحہ بوکھلا کر سرپٹ اندر بھاگی، اور جلدی میں ڈوپٹہ بھی وہیں چھوڑ گئی۔

چھوٹے نواب کے ہاتھوں سے کبوتر اڑ گیا، روایتی پرندہ نہیں بلکہ سچ مچ کا کبوتر۔ جس کے پیروں سے محبت بھرا پیغام باندھ کر وہ اسے سطوت جہاں کی حویلی پر اڑانے والے تھے۔

ڈیوڑھی کے چھوٹے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے جو زنانے میں کھلتا تھا۔ چاند نے یونہی پلٹ کر پیچھے دیکھا، پانی سے بھیگا ہوا وہ گداز اور لچکدار جسم، جسم سے چپکا ہوا وہ تنگ لباس، لباس سے ٹپکتی ہوئی وہ بوندیں اور پھر اس کا وہ گھبرایا اور شرمایا ہوا چہرہ؛

جس پر گھبراہٹ اور شرم سے گہری گہری لالیاں دوڑ گئی تھیں چھوٹے نواب اسی لمحہ چاند پر مر مٹے۔

"بوا کہانی سنا"

شاہد میاں حسب معمول رات کو بستر پر جاتے ہی بولے امیروں کے چونچلے بھی خوب ہوتے ہیں، شاہد میاں جن کی

عمر بمشکل چھ سات برس رہی ہو گی، اصولوں کے اتنے پابند تھے کہ جب تک رات کو کہانی نہ سن لیتے انہیں، نیند نہ آتی۔

حسب معمول چاند نے اپنی وہی پرانی کہانی شروع کی۔

"ایک غریب مزدور کی بیٹی تھی، بے چاری بہت غریب تھی۔ ماں باپ کوئی نہ تھا، ایک دن بھیک مانگتی مانگتی وہ ایک ڈیوڑھی پر آ نکلی، اور نواب صاحب نے اس پر رحم کھا کر اسے پاس رکھ لیا۔"

"کتنی بڑی تھی وہ؟" شاہد میاں پوچھ رہے تھے۔

"بس یہی تمہارے اتنی ہو گی، چھ سات برس کی، محل میں وہ بڑے آرام سے رہ رہی تھی۔ آخر کار وہ بڑی ہو گئی، اسے کوئی دکھ نہ تھا کوئی رنج نہ تھا۔

نواب صاحب اور ان کی بیگم بڑے آرام سے رکھتے تھے اسے، اب جب کہ وہ بڑی ہو گئی، نواب صاحب نے سوچا کہ اس کی شادی کر دیں، مگر مشکل یہ تھی کہ اس کے لائق کوئی لڑکا ہی نظر میں نہ جچتا تھا۔

کیونکہ وہ بہت حسین اور بڑی اچھی تھی۔ کہنے کو تو وہ ایک غریب مزدور کی لڑکی تھی مگر خدا نے اسے اتنی پیاری شکل دی تھی کہ جو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔"

چاند نے شاہد میاں کے پلنگ کے آئینے میں اپنی شکل دیکھی، پھر تھوڑی دیر رک کر بولی۔

"یوں تو وہ بھکارن تھی مگر دیکھنے میں شہزادی سی لگتی تھی، اس کے حُسن اور نزاکت کی وجہ سے کئی لوگ اس سے شادی کرنا، چاہتے تھے۔ —— نواب صاحب بھی بیچارے سوچتے کہ کس سے اس کی شادی کریں"۔

"خرّ خرّ خرّ"

شاہد میاں خراٹے لے رہے تھے، چاند نے سینے تک دلائی کھینچ دی اور خود پلنگ میں لگے آئینے میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔

صبح کا واقعہ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا اور اس کی سانس یوں پھولنے لگی، گویا وہ ابھی ابھی حوض میں سے گر کر نکلی ہو۔ اسے یاد آنے لگا، اس کا حوض میں گر جانا چھوٹے نواب کا ایک دم غیر متوقع طور پر آجانا، اس کا جلدی میں دوپٹہ چھوڑ کر بھاگ جانا، چھوٹے نواب کے ہاتھ سے کبوتر کا اڑ جانا اور پھر اس کا مڑ کر دیکھنا۔

وہ منظر، کہ چھوٹے نوابؔ کا ہاتھ کبوتر کے اڑ جانے سے یونہی پھیلا رہ گیا ہے اور وہ دم بخود اسے یوں گھور رہے ہیں، کہ پلک تک جھپکانے کی سدھ نہیں۔

اس نے دل ہی دل میں شاہد میاں کو ہزاروں گالیاں دے ڈالیں، "نہ وہ مردانے میں چلنے کی ضد کرتے نہ یہ سب ہوتا، قصور تو میرا ہی ہے، گئی ہی کیوں، میرے موئے..." وہ گھبرا گئی۔

وحشت سے اس نے ادھر ادھر آنکھیں گھمائیں، اسے ایسا لگا کہ چھوٹے نواب اب تک اسے گھور رہے ہیں، اس نے اپنا دوپٹہ منہ پر تانا اور وہیں شاہد میاں کی پائنتی کو لیٹ گئی ــــــ۔

چھوٹے نواب کی ٹکٹکی جو ٹوٹی تو انہیں خیال آیا کہ ان کے ہاتھوں میں کبوتر تھا، جو ہاتھ سے چھوٹ کر منڈیر پر جا بیٹھا ہے، سطوت جہاں کے نام جو محبت نامہ لکھا تھا، اسے توڑ مروڑ کر وہیں پھینکا اور بڑے بڑے قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں جا پڑے۔

چھوٹے نواب اپنی "جنرل نالج" کے لئے پورے محل میں مشہور تھے، چمپا کو کتنے مہینے کا حمل ہے، صنوبر کا حمل کون سی دائی نے گرایا، شرافت جنگ ہر تیسری رات کو اپنے کمرے پر کیوں نہیں رہتے۔

اماں جان نے کون سی نئی چھوکری نوکر رکھی ہے، مالن بی کو نوکری سے کیوں الگ کر دیا گیا، روشن بی نے کون سا گرم جوشاندہ پیا تھا کہ چپ چپاتے تیسری ہی خوراک میں ان کا پیٹ گر گیا تھا۔ اماں جان نے زنانے کو مردانے سے ملحق کیوں نہیں رکھا۔

یہ سب باتیں ایسی تھی جن کا علم کسی کو ہو نہ ہو چھوٹے نواب کو ضرور ہو جاتا۔ مگر آج انہیں معلوم ہوا کہ وہ اب تک اندھیرے میں رہے ہیں، کہ ڈیوڑھی میں اک چاند چھپا چھپ

چمک رہا ہو اور وہ اس کی ٹھنڈی کرنوں سے مستفید نہ ہوئے ہوں۔

"بہت تمہارے کی۔"

انہوں نے خود کو گالی دی۔

کروٹیں بدل بدل کر جب وہ بہت ہی پریشان ہو گئے تو انہیں چمپا یاد آئی۔

"وہ چھوکری کون ہے جو حوض پر کھڑی تھی صبح"

انہوں نے بہت ہی بے تعلقی سے پوچھنا چاہا۔

مگر چمپا سے ان کے دل کی لگن چھپی نہ رہ سکی، وہ بھی تو ایک ہی مویشی خانے کی داروغہ تھی، معلوم تھا کون سا جانور کون سا چارہ کھاتا ہے۔

ٹال کر بولی۔

"اے میں کیا جانوں، ہو گی کوئی۔"

"ہو گی کوئی کیا معنی" وہ گرجے "تو زنانے میں نہیں رہتی؟"

"اے حضور زنانے میں تو ہزاروں ہی پڑی ہیں، مجھے کیا معلوم حضور کس کو پوچھتے ہیں۔"

چھوٹے نواب ٹھنڈے پڑے۔

"ارے وہی جس کے لمبے لمبے بال ہیں، گورا گورا رنگ ہے، ارے بھئی کیا پہچان بتاؤں یہ سمجھ لے پھلوارن جو پھول لاتی ہے نا گلاب کے، انہی میں کا ایک پھول سمجھ لے۔"

چمپا جل بھن کر بولی۔

"ارے میاں وہی بھکارن چھوکری ہے جسے بڑے حضور نے دس برس پہلے پال لیا تھا۔ سنتے ہیں کسی غریب مزدور کی بیٹی تھی، پتہ نہیں ماں باپ کدھر مر کھپ گئے تھے۔ بھیک مانگتی مانگتی ڈیوڑھی پر آئی تھی صورت اچھی تھی کم عمر تھی حضور کو ترس آگیا بس رکھ لیا۔ حضور کی زندگی ہو، بڑا نرم دل ہے حضور کا —" وہ اکرم نواب بڑے حضور کو دعائیں دینے پر تل گئی۔

"دس برس!"

چھوٹے نواب کی آنکھیں پھیل گئیں — "مگر ان دس برسوں میں تو وہ ہمیں کہیں بھی نظر نہ آئی۔"

"بلی کے منہ میں چھچھڑہ دے دو تو پھر کھینچنا آسان بات نہیں۔"

چمپا جھلا کر بولی

"حضور نے خیال نہ کیا ہوگا، بیسیوں دفعہ تو دلہن شاہزادی نے اسی کے ہاتھ سے حضور کے لئے پان بھیجے ہوں گے۔ ساری ڈیوڑھی میں تو بھاگی پھرتی تھی، اب ادھر تین برس سے اماں جان نے مردانے میں اس کا آنا جانا موقوف کرا دیا ہے۔"

اور چمپا معنی خیز ہنسی ہنس کر چپ ہو گئی۔

"اچھا تو یہ وہی چاند ہے"، چھوٹے نواب نے دس برس

اوّل کی چھوٹی سی چاند کو اپنی آنکھوں میں لا بٹھایا۔

چمپا اور اس سے زیادہ کیا کہہ سکتی تھی

"اچھا تو یہ وہی چاند ہے، وہی چاند ہے، تو اب اس میں کون سے ایسے سرخاب کے پر لگ گئے ہیں، حرام زادی اماں جان کے دل پر بھی خوب چڑھی ہوئی ہے، کوئی تو خوبی نہیں بس اتنی ضرور ہے کہ محل کی اور چھوکریوں کی طرح، گدگڑے نہیں لگاتی پھرتی، مردوں کو اپنی چھب نہیں دکھاتی ــــ"

چھوٹے نواب نے یونہی بے خیالی میں چمپا کو دیکھا، مگر دراصل وہ چمپا کو نہیں دیکھ رہے تھے۔

"چھوٹی صاحبزادی کے وقت بھی اتنے پر نہ ڈھونڈے ہوں گے حضور نے جانے رانڈ کے پاس کیا جادو ہے"

چھوٹے نواب کی آنکھیں تو چمپا ہی کو دیکھ رہی تھیں مگر چمپا کے پیکر میں چاند مسکرا رہی تھی۔ چمپا نے انہیں بیہوش دیکھ کر آخری چرکا دیا۔

"سینکڑوں پر پلٹائے گئے، اب کہیں جا کر اس کی بات پکی ہوئی ہے۔"

"تو اس کی شادی ہو رہی ہے کیا ــــ؟ چھوٹے نواب ہڑبڑا کر بولے۔

"اور کیا عود دان میں ڈال کر دھونی لیں گے اس کی ــــ؟"

چمپا سڑ سڑ کرتی چلی گئی۔

تب بھی چھوٹے نواب کو یقین نہ آیا کہ چودھویں کا چاند اتنی جلدی غروب ہو سکتا ہے، بادلوں میں چھپ جانا اور بات ہے،

اور اک دم ڈوب ہی جانا ــــ چھوٹے نواب تو یہ جانتے تھے کہ چاند کو بڑھنے میں اگر پندرہ دن لگتے ہیں تو گھٹنے ــــ میں بھی اتنے ہی لگیں گے۔

"بوا کہانی سناؤ"

شاہد میاں نے حسبِ معمول بستر پر جاتے ہی چاند سے فرمائش کی۔

حسبِ معمول چاند نے اپنی وہی پرانی کہانی سنانی شروع کی جو وہ کئی دنوں سے سناتی چلی آ رہی تھی چاند کو اس ادھوری کہانی کے سوا اور کوئی دوسری کہانی یاد ہی نہ تھی۔

چڑیا چڑے، راجہ رانی، طوطا مینا کی کہانیاں نہ اسے سنائی گئیں نہ یاد کرائی گئیں۔ اس لئے وہ روز آ نہ اپنی ہی کہانی سناتی جاتی، جو اس نے ڈیوڑھی میں اپنے بارے میں سن رکھی تھی۔

شاہد میاں بھی ایسے بانگڑو تھے کبھی یہ نہ کہا کہ بوا کیا روز روز ایک ہی کہانی سنائے جاتی ہے۔

ایک تھی لڑکی ...... غریب مزدور کی لڑکی

تھی ، اس لئے بے چاری ....."

شاہد میاں اونگھ رہے تھے۔

" نواب صاحب بھی بے چارے سوچتے کہ کس سے اس کی شادی کریں ۔"

خرّ خرّ خرّ ... "

شاہد میاں سو گئے تھے ، چاند نے سینے تک ، دلائی کھینچ دی۔

" روزانہ اسی مقام پر آکر شاہد میاں کی آنکھ لگ جاتی ہے ۔

" اور میری کہانی ہے بھی تو اتنی ہی ، اگر ایک آدھ دن ان کی آنکھ نہ لگے اور وہ پوری ہی کہانی سننے پر تل جائیں تو اس کہانی کا انجام کیا کر دوں گی ہیں ؟"

چھوٹے نواب کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی ، دن کا چین تو خیراڑ ہی گیا تھا۔

چاند کے بارے میں انہیں پتہ چلا کہ ہے تو غریب کی بیٹی مگر عزت کو یوں لئے لئے پھرتی ہے جیسے نازک آبگینہ ہو ، دھکا لگا اور گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔

چھوٹے نواب کا خیال تھا کہ غریبوں کی عزت کوئی چیز نہیں ہوتی ، اور یہ بھی کہ کم از کم ان کا کھا کر ان سے تو

یہ نمک حرامی نہ کرے کہ اپنے آپ کو چھپاتی پھرے اور پھر چاند کے بارے میں تو انہوں نے یہ سنا کہ پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتی،

یوں قدم اٹھاتی ہے گویا کانچ کے محل میں چل رہی ہو کہ ذرا زور سے قدم بڑھا اور یہ محل چٹخا،

یہی وجہ ہے کہ اپنی پارسائی اور نیک نامی کے سبب سے اماں حضور اور ابا حضور کے دلوں پر چڑھی ہوئی ہے۔ جہاں محل کی اور دوسری چھوکریاں معاشقے لڑاتی پھرتی ہیں،.... !

چاند کا یہ حال ہے کہ کسی مرد کی صورت دیکھتے ہی ایسی حواس باختہ ہوتی ہے کہ پسینہ چھوٹ جاتا ہے، اور پھر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہے کہ گھبرائے گی ضرور مگر ہمت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گی۔

چھوٹے نواب کو اسی سلسلے میں یہ بھی پتہ چلا کہ اصطبل کے داروغہ نے ایک بار اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا تو چاند نے اتنی زور سے اس کے ہاتھ کو کاٹا کہ منہ میں گوشت کا مچہ آگیا تھا۔

"پھر یہ سونے کی چڑیا ہتھے کیسے چڑھے ؟"

وہ کسمسائے

"مگر تم بھی اپنے چچا کے بھتیجے نہیں اگر چاند کی ناک نہ گھسوا لی اپنے آگے"

اس دن کے بعد سے چھوٹے نواب کو ایک بار بھی تو چاند کی جھلک نہ دکھائی دی۔ انہیں آجا کے سارا غصہ شاہد میاں پر ہی آتا تھا۔

"آخر یہ حرامی بلا ضد کیوں نہیں کرتا کہ مجھے باہر دالے حوض پر لے چل"

اور چاند کی شادی کی خبر سن کر تو گویا دل پر سانپ ہی لوٹ گئے۔

"کس کا چاند، اور چاندنی کس کے نصیبوں میں آئی"،

انہوں نے اپنے لمبے چوڑے پلنگ کو دیکھا،

"ہائے ہائے چاند کا پھول ایسا جسم"۔ اور وہ تڑپ کر رہ گئے......!

زنانے میں جانا قیامت صغرا سے کم تو نہ تھا۔ یہ بھی ایک عجیب مصیبت تھی اماں جان نے جو قاعدہ بنا رکھا تھا، اس سے کوئی ایک انگل بھی ادھر ادھر نہ ہٹ سکتا۔

قیامت صغرا چھوڑ قیامت کبریٰ ہی کیوں نہ آجاتی، مگر اب تو جانا ضرور تھا، پریشان حال پریشان صورت، بال بکھرائے اک دم چک اٹھا کر داخل ہو گئے۔

اماں جان الگ بد حواس ہو گئیں پوچھنے کی مہلت بھی نہ ملی کہ "اے میاں یہ دن دہاڑے زنانے میں کیوں گھس آئے۔" کہ دم چھوٹے نواب پھٹ پڑے۔

"میں نے سنا ہے آپ نے چاند کی بات پکی کر لی ہے"

اماں جان بوکھلائی ہوئی تھیں، کیا جواب دیتیں.

"مجھے تو آج پتہ چلا، کم بخت بڑے درجے کا شرابی، آوارہ تین تین عورتیں تو گھر میں گھسا رکھی ہیں، چاند یتیم ہے، یسیر ہے، لاوارث ہے تو کیا آپ پر اس کا یہی حق ہے کہ جان بوجھ کر کنوئیں میں جھونک دیں.....

ویسے اگر کنوئیں میں جھونکنا ہی ہوتا چنداں مضائقہ نہ تھا مگر......"

اور آواز ان کے گلے میں گھٹ کر رہ گئی.

اماں جان پر آج اپنے بیٹے کی غربا پروری اور نرم دلی کی حقیقت کھلی.

"پالی نوازیوں، باندی بندوڑیوں پر کیسے جی کڑھا رہا ہے میرا بچہ"

شرمسار ہو کر آنکھیں جھکا لینے کے سوا چارہ ہی کیا تھا ویسے جھوٹ موٹ ہی یہ پوچھ بیٹھتیں کہ کس کے بارے میں کہہ رہا ہے تو جناب کو دم دباتے ہی بن پڑتی، مگر چھوٹے نواب کی صورت پر اس وقت وہی غم چھایا ہوا تھا جو کسی عزیز کی میت کو کاندھا دینے کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے.

چاند پیک دان اٹھائے چلی آرہی تھی، نگاہیں اٹھا کر جو دیکھا تو سامنے ہی چھوٹے نواب یوں پریشان حال اور غم زدہ صورت بنائے بیٹھے تھے. گویا چمپا کی موت کی خبر لے کر آئے ہوں.

دچھوٹے نواب کو چمپا سے دیوانگی کی حد تک عشق تھا،

ڈیوڑھی میں یہ بات بالکل عام تھی)، اماں جان نے محبت بھری نظروں سے چاند کو دیکھا اور چٹ چٹ بلائیں توڑیں۔

ہے ہے، میری بچی کا نصیبہ ہی پھوٹ گیا تھا، سمجھو وہ تو چھوٹے میاں ہوتے نہ بھدرہ پھوٹتا۔

چھوٹے نواب نے حیران ہو کر اماں جان کی طرف دیکھا۔ چاند کی اس طرح والہانہ محبت کر رہی تھیں کہ کبھی گل بانو کی بھی نہ کی ہوگی۔

چاند نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے چھوٹے نواب کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں وہی وحشت اور چمک نظر آئی جو اس دن دوپٹہ چھوڑ کر بھاگ آنے والے روز نظر آئی تھی۔ ایک دم بوکھلا کر اس نے خود کو دیکھا۔

" دوپٹہ تو میں اوڑھے ہوئے ہوں پھر یہ کیوں ایسی کوری کوری نگاہوں سے تاک رہے ہیں مجھے۔ "

اس رات چاند کو کہانی سنانا بھی نہ سوجھا، بار بار رک جاتی اور شاہد میاں اسے ٹھیلتے۔

" ہاں آگے کیا ہوا ؟ "

وہ بار بار چونک کر اپنے آپ کو دیکھتی، پانی سے بھیگا ہوا جسم، جسم سے چپکے ہوئے کپڑے، کپڑوں سے ٹپکتی ہوئی بوندیں، دوپٹہ حوض کی منڈیر پہ پڑا ہوا، اور ایک دم چھوٹے نواب کے ہاتھوں سے کبوتر اڑ گیا۔

سطوت جہاں کے پاس سے جو کبوتر آیا تو چھوٹے نواب

نے اس کی گردن ہی مروڑ دی، اتنے دنوں کی پیغام رسانی کا اسے یہی صلہ ملنے والا تھا۔ محبت نامہ پڑا ہوا کے جھونکوں سے کانپتا رہا اور چھوٹے نواب غصّہ میں ہاتھ ملتے رہے۔

چاند ایک جھلک دکھا کر چھپ گئی تھی، اور یہ اندھیرا ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا، اندھیرا دور ہو تو کیسے؟

ذہن نئی نئی ترکیبیں لڑاتا، مگر کچھ بس نہ چلتا، لیکن تھے کس چچا کے بھتیجے، سلامت جنگ کے، وہ جو کسی نے کہا کہ گلاب کے نیچے کی مٹی بھی خوشبودار ہوتی ہے، تو مٹی چھوڑیے تو خود ہی گلاب کا اپنا ایک حصہ تھے۔

سلامت جنگ نے کیا کیا عیش نہیں کئے تھے، بھتیجہ میں کچھ نہ کچھ تو خوبو آنی ہی تھی چچا کی۔

اس دن کا زنانے میں جانا ایسا مبارک لگا کہ اماں جان کی ساری پابندی دھری کی دھری رہ گئی۔ اور چھوٹے نواب کھلے بندوں آنے جانے لگے۔

کہاں تو اماں جان کا وہ کڑک دار آواز سے چلانا کہ زنانے میں بلا ضرورت کسی مردوے نے قدم دھرا تو پاؤں کٹوا کر جلتے تیل میں ڈبا دوں گی۔ اور اب کہاں یہ دن کہ چک اٹھائی اور گھم سے اماں جان کے کمرے میں۔

اور اماں جان کو شک بھی کیوں ہوتا؟ سیدھے انہی کے کمرے میں تو آتے تھے وہ کسی سے چھیڑ چھاڑ کی بات سننے میں آئی نہ کسی کو بری بری نظروں سے گھورنے کی، یہ ضرور ہے کہ

چھوٹے نواب کے کرتوت ان سے چھپے نہ تھے۔

اگر چھپے ہی ہوتے تو دلہن شاہزادی اپنی جان کو روتی اپنے جالی دار کمرے میں اکیلی پڑی ایک بیٹے کے واسطے ترسا اور تڑپا نہ کرتیں اور ادھر چمپا اور صنوبر کے حمل نہ گرائے جاتے۔

دلہن شہزادی کو بانجھ قرار دیا گیا اور وہ ایک چاند سا بچہ جھلانے کی آرزو ہی کرتی رہتی تھیں۔

مگر اس وقت تو اماں جان کو شک کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی، انہوں نے چھوٹے نواب کی آنکھوں میں وہ تڑپ اور بے چینی دیکھ لی تھی جو چاند کے دکھ سکھ سے متعلق تھی اور وہ اس دن تو خود پر نازاں ہو گئیں تھیں جب چھوٹے نواب کی آنکھوں میں چاند کے بیاہ کی بات کرتے کرتے آنسو چھلک آئے تھے کہ میری کوکھ سے بھی کیسے بیٹے نے جنم لیا ہے۔

ہاں ادھر ادھر لڑکیوں بالیوں میں بہت چہ میگوئیاں تھیں سبھی کو یہ بات کھل رہی تھی کہ اماں جان نے آخر سب کو چھوڑ چھاڑ کے صرف بڑے بھائی پر سے ہی کیوں یہ پابندی ہٹا لی۔ اماں جان کی آنکھیں بوڑھی ہونے سے دھند لا گئی ہوں اور وہ دیکھ نہ سکتی ہوں یہ اور بات ہے۔ مگر دیکھنے میں آنکھیں ذسات پردوں کو چیر کر دور کی خبر لاتی ہیں۔

چاند تو چھوٹے نواب کی آنکھوں سے ایسی خائف تھی کہ ایک بار گھبراہٹ میں شیشے کا وہ پیک دان ہی توڑ بیٹھی جسے بڑے حضور دلّی سے لائے تھے اور جس میں آئینہ بھی

لگا ہوا تھا کہ تھوک بھی دو اور صورت بھی دیکھ لو۔ چھوٹے موٹے چینی اور یہ کانچ کے برتنوں کا تو ذکر ہی کیا، روزانہ شہید ہو رہے تھے۔

آنکھیں تو وہ بھی رکھتی تھی، سمجھ بوجھ بھی اچھی خاصی تھی۔ اور پھر یہ تو وہ بھی دیکھتی تھی کہ چمپا اور صنوبر سارے زنانے میں کیوں ہر یہ ملامت بنی ہوئی تھیں؟

مالن بی کیوں بلا الزام نوکری سے ہٹادی گئی؟ اور یہ سارے کرتوت انہی چھوٹے نواب کے نہیں تو اور کس کے تھے۔

ایک ہاتھ سے بال برابر کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے چک اٹھا کر اندر داخل ہوئے تو سامنے ہی چاند اماں جان کے بستر کی شکنیں صاف کر رہی تھی۔ بے تعلق سے بولے۔

"اماں جان کہاں ہیں؟"

چاند نے پلٹ کر دیکھا۔

چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا، گھبرا کر اٹکتے اٹکتے بولی۔

"وہ بازو ... بازو والے کمرے میں ہیں .... کپڑے بدل رہی ہیں"

چھوٹے نواب کو وہ جھنجھنے یاد آگئے جو وہ چمپا کے بچے کے لئے خرید کر لائے تھے اور جنہیں چمپا کا بچہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے الٹ پلٹ کرتا تو اسی طرح اٹکتے اٹکتے جھن جھنایا کرتے تھے۔

چھوٹے نواب بھی اس لمحہ ایک بچہ بن گئے۔ ان

کا دل چاہا پھر سے اسی جھنجھنے کی جھنکار سنیں، بات چلانے کو بولے

" تم اتنا کام کیوں کرتی ہو چاند ؟"

چاند ہنس پڑی۔

(چھوٹے نواب کو چاندی کا وہ جھنجھنا یاد آیا جو شاہد میاں اب سے تین برس پیچھے بجاتے پھرتے تھے)

مگر دوسرے ہی لمحہ سہم سی گئی

" کام کیا کرتی ہوں میں، اماں حضور مجھے کرنے ہی تو نہیں دیتیں، مجھے تو بیٹی بنا لیا ہے انہوں نے "

چھوٹے نواب بوکھلا کر مڑے

" اماں حضور ...."

وہ جلدی جلدی بول گئے

" میں آج اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے کچھ کہہ سکوں یعنی چاند کے بارے میں کچھ کہہ سکوں "

" نہیں بیٹا نہیں، میں اسے ناپسند کرتی ہوں، تمہارے ابا خود اسے ناپسند کرتے ہیں۔ میری چاند ادبر کی نہیں آئی کچھ، اللہ کے یہاں بھی تو جواب دینا ہو گا کہ کسی یتیم کو پالا تھا تو اس کے ساتھ کیا برابری کی "

وہ سمجھی تھیں کہ چاند کے بارے میں ہی کچھ کہا جائے گا مگر چھوٹے نواب ہنس پڑے،

" نہیں اماں حضور، وہ بھلا چاند کے لائق کیا ہو گا، لیکن اس وقت میں اس بارے میں نہیں کہہ رہا تھا، میں یہ

کہہ رہا تھا کہ چاند کے لئے آپ اتنی پریشان ہو رہی ہیں لیکن، اصل وجہ تو آپ کو معلوم ہی نہیں۔

اماں جان نے لاعلمی سے منہ تکنا شروع کر دیا۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ چاند حسین تو ہے ہی، پیسہ بھی آپ کی وجہ سے بہت کچھ مل جائے گا۔ بغدادی قاعدہ اور قرآن تو پڑھتی ہو گی، انگریزی بھی تھوڑی بہت ہی پڑھا دی جائے تو سمجھتا ہوں کہ آپ کو بر کے لئے اتنا پریشان نہیں ہونا پڑے گا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ آج کل انگریزی کی کتنی قدر ہے"۔

"مگر پڑھائے گا کون ؟" اماں جان ایک دم پوچھ بیٹھیں۔ کوئی غیر مرد آکر پڑھائے، یہ خیال ہی جان لیوا تھا۔

چھوٹے نواب نے ہنس کر سر جھکا لیا۔

"جہاں آپ نے چاند کو اپنی بیٹی کی طرح پالا کہ لوگ گل بانو اور چاند میں فرق تک محسوس نہیں کرتے وہاں میرا کیا اتنا بھی فرض نہیں کہ اسے تھوڑا بہت پڑھا ہی دوں، بے چاری کی زندگی سدھر جائے گی، اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے"۔

اماں جان نے یہ لمبا سانس لیا۔ اور چاند نے گھبرا کر دیکھا کہ چھوٹے نواب کی آنکھیں بری طرح چمک رہی ہیں۔

اے، بی، سی، ڈی،

چھوٹے نواب نے اپنے ہاتھ سے چاند کی انگلیوں میں قلم تھمائی، اور چاند پوری کی پوری کانپ کر رہ گئی

"آپ زمین پر رکھ دیجئے میں آپ اٹھالوں گی"۔

چھوٹے نواب نے اسے کھانے والی نظروں سے دیکھا اور آگے پڑھانے لگے۔

"سی، اے ٹی، کیٹ"

چاند ایک دم بول اٹھی ــــــ "مگر مجھے انگریزی نہیں پڑھنا ہے، کیا کرونگی میں پڑھ کے"

"چاند کو چاند جیسا دولہا ملے گا"۔ چھوٹے نواب نے انگلی اس کے گال سے چھوادی۔

چاند بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ چھوٹے نواب بے تعلقی سے پڑھانے پر تلے ہوئے تھے۔

"ایم، سے مون، مون کے معنی جانتی ہو چاند، چاند یعنی تم مون ہو"

چاند خاموش ہی رہی۔

"بیٹھ جاؤ"

چاند انہیں گھورتی رہی، چھوٹے نواب ہنس پڑے "اوہ، غلطی میری ہی ہے، پوری تختی تو یاد ہی نہیں ہوئی تمہیں ابھی، اور میں نے آگے پڑھانا شروع کر دیا....

ارے تم کھڑی ہی ہو، اماں حضور سے کہہ دوں گا

پڑھتی نہیں بھاگ جاتی ہے "

چاند بیٹھ گئی ۔ اے، بی، سی، ڈی، نظریں جھکا کر وہ پڑھنے لگی،

مگر ہر بار حروف اس کی آنکھوں کے آگے سے پھسل پھسل پڑتے۔

"مجھے یاد نہیں ہو رہا، میں اماں جان سے کہہ دوں گی میں پڑھ نہیں سکتی "

اور وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی، اس کی آواز کانپ رہی تھی

چھوٹے نواب اسے ایک لمحہ تک دیکھتے رہے پھر لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"چاند..... !" وہ اور کچھ نہ کہہ سکے

چاند کو ان کی آنکھوں میں ایسی وحشت نظر آئی کہ اس کے سامنے ایک ننھا منا سا بچہ ہی تو کھیلنے لگا، وہ سلگ اٹھی۔

" میں غریب ہوں تو کیا اس کا یہی مطلب ہے آپ پڑھانے کے بہانے تنہا کمرے میں لاکر میرا ہاتھ پکڑ لیں "، اور اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی ناکام کوشش کی

چھوٹے نواب ایک لمحہ کے لئے بوکھلا سے گئے، مگر سنبھل کر بولے

" غریبی کا اور مطلب ہی کیا ہے، بڑی پارسا بنی پھرتی ہے اب بتاؤں گا پارسائی کیا ہوتی ہے "

" اور میں بھی بتاؤں گی غریبی کا مطلب کیا ہوتا ہے، ہاتھ چھوڑ دو میرا ،، وہ پورے اعتماد سے بولی۔

چھوٹے نواب نے پوری مضبوطی سے ہاتھ پکڑ لیا۔

" چھوڑ دے کم بخت میرا ہاتھ ،، اور چاند نے پاس پڑی ہوئی تختی پوری طاقت سے نواب کے سر پر کھینچ ماری، چھوٹے نواب نے " سی ،، کی آواز نکالی ، اور وہ سر سہلاتے ہوئے چاند کمرے سے باہر تھی

" کیوں بیٹا، چاند نے کچھ یاد بھی کیا ؟" اماں جان خوشی خوشی چھوٹے نواب سے پوچھ رہی تھیں۔

" بہت تیز ہے ماشاء اللہ ، اتنی کم مدت میں بہت کچھ سیکھ گئی ۔ ،، چھوٹے نواب نے سنجیدگی سے جواب دیا ۔" مگر ایک بات ہے اماں حضور، یہ پڑھتے پڑھتے دروازے کی طرف دیکھتی رہتی ہے ، ہر آنے جانے والے پر نگاہ ڈالتی رہتی ہے ، اس سے پڑھائی کا بہت نقصان ہوتا ہے ،،

اماں جان ہنس پڑیں ۔۔۔ " اے ہے تو دروازہ بند کر لیا کرو ، دروازہ ہی بند رہے گا تو کیا خاک دیکھے گی ۔ ،،

اور انہوں نے پلٹ کر چاند کو دیکھا جو اس ہدایت کو سن کر برف ہو گئی تھی بمشکل وہ بولی

" اماں حضور .... میں .... میں پڑھنا نہیں چاہتی ، آپ ...،،

چھوٹے نواب نے اشاروں میں مطلب صاف کر دیا۔

"جان چراتی ہے، مگر کب تک بچے گی، اماں جان آپ مجھے اجازت دے دیجئے میں اسے ٹھونک بجاکر پڑھاؤں گا تو چند ہی دنوں میں فرفر انگلش بولے گی، اور ہاں آپ نے اس کے پیام کا کیا جواب دیا؟"

چاند نے اس لمحہ ایسا محسوس کیا جیسے اس کی قسمت کا چاند گہن گیا ہو!"

ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور چھوٹے نواب زہریلی ہنسی ہنس رہے تھے.

"بچ بچ.... " انہوں نے نمک چھڑکا " ماروں گا نہیں بالکل بھی نہیں ماروں گا، مگر ہاں زیادہ گڑبڑی کی تو کان ضرور کھینچوں گا۔"

چاند سلگ اٹھی ۔ "آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

چھوٹے نواب شانے ہلاکر ہنسے "چاہوں گا کیا، کچھ بھی نہیں، بس تمہیں چاہتا ہوں اور کچھ نہیں"۔

چاند اٹھ کھڑی ہوئی، چھوٹے نواب سامنے آکھڑے ہوئے.

"ارے بیٹھو بھی، جاتی کہاں ہو، اس دن تو تختی سے اپنا بچاؤ کر گئیں مگر آج؟"

انہوں نے قہقہہ لگایا.

"مگر بھئی چاند، مانتے ہیں تمہیں، اتنی لڑکیاں ہم نے برتیں آج تک ایسی ضد، ایسی خودسری کسی میں نہ پائی

تم واقعی چاند ہو ـ"

اور انہوں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا منہ اونچا کیا۔

وہ پھر بولی ــ "چھوٹے نواب اپنی حد سے آگے نہ بڑھو ـــ"

"حد ـــ ہماری حد کو پوچھتی ہو، ارے ہمارے باپ کی ڈیوڑھی ہے یہ ہماری حد کیا ہوئی، کوئی حد نہیں ہمیں، کوئی ڈر نہیں"

"تم نے شراب تو نہیں پی رکھی، میں تمہارا خون پی جاؤں گی ـ"، وہ زخمی ناگن کی طرح پھن پھنائی۔

"ہاہاہا ــــ"

چھوٹے نواب ہنس پڑے بالکل دیوانوں کی طرح ـــ "پی جاؤ میرا خون پی جاؤ، کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، سمجھیں"

"میں چلا چلا کر پوری ڈیوڑھی کو اکٹھا کر لوں گی ـــ"

چاند نے اپنی دانست میں اپنی مدافعت کی۔

"ہونہہ"

وہ حقارت سے ہنسے

"ذرا سی بچی کی عقل ہی کتنی، میں نے اول ہی دیواریں خوب اونچی کر لی ہیں، تم چیخیں بھی تو،

اماں جان یہی سمجھیں گی کہ تمہیں ٹھونک بجا کر پڑھا رہا ہوں اور پھر چاند ....."

انہوں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"اماں حضور نے پہلے ہی تاکید کر دی ہے کہ وقت پڑنے پر دروازہ بند بھی کر لیا کرو، میں دروازہ بھی بند کر سکتا ہوں، سمجھ گئی نادان لڑکی۔"

چاند نے تلملا کر ان کی طرف دیکھا۔ "میں تمہاری بوٹیاں اڑا دوں گی۔"

"تم سے پہلے میں تمہاری بوٹیاں اڑا دوں گا" انہوں نے میز پر رکھی ہوئی بندوق کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ دیکھتی ہو کیا ہے؟"

انہوں نے بندوق ہاتھ میں اٹھا لی۔

"یہ سب گولیاں بھری ہوئی ہیں، اور یہ رہی لبلبی ادھر لبلبی دبائی اور ادھر گولی سینے کے پار، زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ جیل ہو جائے گی، بہت ہوا پھانسی مگر ......"

چھوٹے نواب کا چہرہ کرہیہ ہو گیا

"مگر اس سے ہوتا ہی کیا ہے ہم نواب ہیں پیسے والے ہیں، اس کی نوبت ہی کہاں آئے گی، ارے پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے چاند رانی۔" اور

وہ بندوق وہیں رکھ کر دروازے کی طرف بڑھے چاند کی طرف انکی پیٹھ تھی۔

ان کے منہ پھیرتے ہی چاند نے بندوق اٹھالی اور نال اپنے سینے سے لگالی۔

"دھائیں، دھائیں۔"

آواز گونجی اور چھوٹے نواب کا ہاتھ چٹخنی پر سے کھسل پڑا۔ پیچھے پلٹ کر دیکھا تو چاند تڑپ رہی تھی۔

زندگی کا یہ روپ، غریبی کی یہ غیرت یہ ادا آج تک چھوٹے نواب کی نگاہوں سے پوشیدہ تھی۔

پتہ نہیں کون سے جذبے نے انہیں زیر کیا کہ وہ رہ نہ سکے۔

اور اسی بندوق کو اٹھاکر اپنے سینے سے لگالیا۔

چاندنی

عورت تھی یا ایٹم بم ___؟

حواس پر ___، ذہن پر ___، ہوش پر ___، سارے وجود پر یوں گری کہ سب کچھ تہس نہس ہو گیا راکھ ہو گیا ___

سکندر دیوانہ ہو گیا ___ ان معنوں میں دیوانہ نہیں کہ پتھر اٹھا اٹھا کر دے مارے، کسی کو جانے پہچانے ہی نہیں، بلکہ ان معنوں میں کہ اپنا آپ بھول گیا ایک سڑی ماری عورت کے پیچھے ___ عورت بھی کون ___؟ رنڈی ___!

مگر بھئی کیا عورت تھی کہ واہ وا ___ بدن کی چمڑی یوں کسی کسی کہ کوئی چہرہ دیکھنا چاہے تو آئینہ سمجھ کر دیکھ لے ___ چھاتیاں یوں تنی تنی کہ کوئی کنکر دے

مارے تو تن سے بج اٹھیں ــــــ کمر تو مٹھی میں سما جائے۔ بال ایسے گھنگور گھور کہ سارے بدن سے ننگی ہو کر بیٹھ جائے، اور بال کھلے چھوڑ دے تو کسی کو پتہ نہ چلے کہ اس سیاہ پردے کے پیچھے کون سی آگ دہک رہی ہے۔ کیسی دمادم بجلیاں کوند رہی ہیں ــــــ قد بس اتنا کہ نخرے میں آ کر مرد کے کندھے سے سر ٹکائے، تو گردن کے خم میں پہنچ کر اوچائی فٹ ہو جائے ــــــ اور مرد کو بس یہی تو اچھا لگتا ہے کہ عورت اس سے نیچی رہے، دبتی رہے، دبی رہے ــــــ

اور بس سکندر بھی یہی کچھ تھا کہ ایک مرد ہوتا ہے۔ جان تو اس کے ایک ہی تھی، مگر وہ ایک چھوڑ ہزار جانوں سے عاشق ہوا۔ مٹ گیا ــــــ

کیسے کیسے چاہا کہ اسے زندگی بھر کے لئے اپنے گلے کا تعویز بنا لے، مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ رنڈی کا دل سدا ہنڈی ہیں ــــــ

ایک کے گلے سے عمر بھر کے لئے لپٹ کر کیا اسے اپنی زندگی تباہ کرنی تھی ــــــ؟ چمکیلی چیختی ناگن کی طرح خود ہی بچھا کیا، لیکن جہاں مڑ کر ہاتھ میں اٹھانا چاہا ــــــ سل سلا کر چھوٹ گری، دغا دے گئی۔

ساری داستان یہ تھی کہ وہ طوائف جس کا نام چاندنی تھا، کسی شادی کی محفل میں بلوائی گئی تھی، شادی کریم

بزنس مین کی بیٹی کی تھی کہ جس کی کپڑے کی چار چار ملیں تھیں
پھر اناج کی دکانیں ___ پھر زیورات کی دکانیں ___
پھر دواؤں کی دکانیں ___ پھر جنرل اسٹور تھے اور
پھر ___ بس اس پھر پھر کی روداد ہی یہ تھی کہ
پیسہ پھرکی کی طرح پھر پھر پھرتا تھا ___ اور جب
بیٹی کی شادی ہونی ٹھہری تو کون سی بات چھوٹی ___؟
ہر ہر قسم کے اعلیٰ سے اعلیٰ انتظامات تھے ___

اور اسی میں ایک انتظام یہ بھی تھا کہ ناچ گانے سے
بھی باراتیوں اور حاضرین جلسہ کو محظوظ کیا جائے۔
اب ان چاندنی بیگم کے یہ ٹھاٹ تھے کہ وہ ایسی ویسی
محفلوں میں قدم کبھی نہ دھرتی تھیں۔ دو سو، پانچ سو
کی ان کے پاس کون بساط تھی ___

وہ جب بھی محفل میں گئیں، رات بھر کے کھٹن
کھٹن پانچ ہزار روپے گنوا لیے ___ اور وہ بھی اس
صورت اور اس شرط میں کہ کوئی ان کے انگلی بھی
نہ لگائے ___ ان کا جسم انگلی لگانے کے لیے نہ
بنا تھا، وہ تو صرف آواز بیچتی تھیں اور بس لچکیلے جسم
کی جلت پھرت سے پیسہ بٹورا کرتی تھیں ___

شادی کا ہنگامہ، نکاح کا دھوم دھڑاکا، کھانے
دانے سے فراغت جب سب مرحلے طے ہو گئے تو محفل
سجی ___ اگلی قطار بے حد رئیس زادوں کی تھی

——— وہ جو ایک ایک ادا پر خزانے خالی کر دیتے ہیں ———؛

اس کے پیچھے وہ جن کے پاس سیکنڈ ہینڈ کاریں اور سیکنڈ ہینڈ دل ہوتے ہیں،

اس کے پیچھے لٹے ہوئے بگڑے ہوئے نواب جن میں اکثریت حیدرآباد کے برباد نوابوں کی تھی —

اس کے بعد ایسے ہی جیب خالی رکھنے والے اور پٹاپٹ آنکھیں مارنے والے، جیسے ان کے آنکھ مارنے سے رنڈی ان کی گود میں ہی تو آ بیٹھے گی

پھر تو محلے لوٹنے کے لوگ، خانساماں لوگ بیرے، ڈرائیور، شوفر لوگ، جو صرف کھڑے کھڑے ترسی ترسی نگاہوں سے نظارۂ محبوب کرتے ہیں.

اگلی صف میں ظاہر ہے سکندر بھی تھا، کیوں کہ وہ خود بھی کپڑے کی چھ ملوں کا مالک تھا.

گانا شروع ہوا ———؛

چاندنی نے پہلے تو حاضرین شادی پر ایک چھچلتی سی نظر ڈالی اور پھر شاید محفل کا رنگ دیکھ کر شروع ہو گئی ـــ

ہم بھی پیئیں انہیں بھی پلائیں تمام رات
جاگیں تمام رات جگائیں تمام رات

سننے والوں نے پہلو بدلنے شروع کئے ــــــ چاندنی ڈائس پر تھی اور سکندرہ ڈائس سے بہ مشکل دو تین قدموں کے فاصلے پر ؛

اس نے پھر ادا سے تان لگائی ے

دلبے رہے پردوں میں نشیمن کو رات بھر
ان گیسوؤں کی لی ہیں بلائیں تمام رات

اور کم بخت نے اپنے سیاہ اور لانبے بال کھول کر خود ہی بلائیں لے ڈالیں ۔

کتنے کٹے ، کتنے مرے ، کتنے گھائل ہوئے ۔ اس کا لحاظ کئے بغیر وہ چالو تھی ے

شب بھر رہے بہم ہم آغوشیوں کے لطف
ہوتی رہیں قبول دعائیں تمام رات

سننے والوں نے اس قدر بے چین ہو کر ، یوں بے کل ہو ہو کر صوفوں پر کروٹیں بدلیں جیسے صوفوں میں ، کئی کھجورے گھس پڑے ہوں ۔

سیاہ گھٹاؤں میں سے چاند ایسا چمکتا چہرہ ــــ کافر شباب صحیح معنوں میں کافر کر دینے والا ــــ غضب خدا کا تلون کا پھنسا ہوا بلاؤز کہ یہ پتہ ہی نہ چلے کہ کپڑا کدھر ہے اور بدن کی جلد کدھر ــــ ؟ اور پھر اس نے تان ملائی ــــــ

سکندرہی کو دیکھ کر ے

مدت سے آرزو ہے یہ دل میں بسی ہوئی
اے کاش تم کو ساتھ سلائیں تمام رات

اک دم محفل میں ٹیس پڑ گئی ——— سب نے بوکھلا کر ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کیا ——— سکندر صوفہ سے کودا اور اس کے قریب جا کر بولا

"غضب کرتی ہیں آپ بھی ——— غزل میں اس شعر کا پتہ ہی نہیں، جو چاہے الٹ پلٹ گا رہی ہیں آپ!"

وہ ایک عورت کی طرح نشیلی اور دل جیت لینے والی ہنسی ہنس کر بولی۔

"میں کب کہتی ہوں غزل میں تھا ——— یہ شعر تو میں نے اپنے دل سے جوڑا ہے۔"

سکندر صوفے پر واپس آ گرا ——— اب اس میں کچھ پوچھنے، سوچنے، کسی بات کی صلاحیت نہیں رہ گئی تھی، ابھی ابھی تک تو چاندنی ایک خوبصورت دیئے کی مانند تھی، جھلملاتی شمع کی مانند، کہ جس کی طرف دیکھنے سے آنکھوں کی جوت ماند نہیں پڑتی، بلکہ خود آنکھوں میں جگمگاہٹ مچل اٹھتی ہے۔

لیکن ابھی ابھی وہ ایک شعر "دل سے جوڑ دینے" کے بعد، ایک بجلی بن گئی تھی ——— ایسی بجلی جس کی طرف دیکھو تو نہ صرف یہ کہ بینائی سے ہاتھ دھونا پڑے، بلکہ جو تن من سب کو جلا کر خاکستر کر دے ———

رنڈی پر دل آجانا ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں، وہ بھی تو دال، آٹے، بھاجی، پھل کی طرح ایک سودا، ہوتی ہے کہ پیسہ پھینکو اور من بھاتی چیز حاصل کر لو اور سکندر نے بھی یہی کیا ـــــ وہ تو لاکھوں میں کھیلتا تھا، اس کے لئے پیسہ بے معنی شے بن چکا تھا ـــــ بمبئی جیسے شہر میں مالا بار ہلز پر کوٹھی ـــــ اور وہ بھی ذاتی کوٹھی، کیا بات ہے جناب ـــــ ایسی ایسی کئی کوٹھیاں، زمینیں اور ذاتی جائداد، اس کی قسمت سے بمبئی میں پھیلی ہوئی تھیں ـــــ

نام کا ہی سکندر نہ تھا قسمت کا بھی سکندر تھا اسے پتہ لگ چکا تھا کہ چاندنی بھی اس کے قرب و جوار میں ایک چھوٹی سی خوب صورت سی کوٹھی میں رہتی ہے جس کا نام اس نے "چاند نگر" رکھ چھوڑا تھا ـــــ اس نے یوں کئی بار آتے جاتے اس نام کو دیکھا ہوگا لیکن یہ پتہ نہ تھا کہ چاند نگر میں واقعی کوئی چاندنی بھی چھپی ہوگی ـــــ

ایک دن وہ بڑے ٹھاٹ کے ساتھ وہاں پہنچ ہی گیا ـــــ

ڈرائنگ روم میں ایک سڑیل سی بوسیدہ بڑھی نے جب اس کا استقبال کیا تو وہ حد درجہ بور ہوگیا۔ یہ کیا مصیبت ہے سالی ـــــ یہ اس قسم کی ماڈرن

اور مہذب خواتین اپنے ساتھ نائیکہ کیوں چپکا لیتی ہیں ــــــ کم سے کم اسٹیشن ڈاگ سے تو یہ کام نکل ہی سکتا ہے۔ اشارہ کیا کہ وہ دوڑا۔

اب آپ فرض کیجئے میں آپ کی بیٹی، یا پوتی، یا نواسی، جو کچھ بھی وہ ہیں، انہیں اٹھا کر لے بھاگوں اور کار میں بٹھا کر چھو ــــــ تو جناب آپ میرا کیا سدھار لیں گی ــــــ؟ وہ ہنسا اور بے حد مہذب مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر اور دل کی ساری تلخی اور بوریت دل میں گاڑ کر بولا ــــــ؛

"میں مس صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں"

پھر اس ایک جملے سے جس گفتگو کی ابتدا ہوئی تھی، اس کے اختتام پر جا کر اسے یہ پتہ چلا کہ یہ جو چاندنی چاندنی بیگم ہیں ــــــ چاند ہی کی کرنوں کی طرح، شیتل، سنہری، پاک اور ہاتھ میں نہیں آنے والی ہیں ــــــ اس لئے کہ وہ رنڈیوں کے اس خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جو صرف گلا ــــــ یعنی آواز اور جسم کی چلت پھرت، یعنی رقص کا ہی سودا کیا کرتی ہیں "ادھر وہ سب کچھ نہیں چلتا۔ جو آپ سوچ کر آئے رہوں گے ــــــ"

"اور پھر بھی ایک رات کے پانچ ہزار ــــــ!"

سکندر نے اپنا سر کھونک لیا ــــــ پھر دل نے

سمجھایا ——،

" ٹکو میاں، اپنا رستہ پکڑو —— رات بھر کے پانچ ہزار دے کر بھی آخر میں کیا ملیں گا بول کے ؟"

لیکن اب سکندر کا عشق اس حد پر پہنچ چکا تھا کہ اور کچھ نہیں تو نہ سہی، خالی لگا ہوں کی پیاس ہی بجھتی رہے چلتے چلتے اس نے بڑے ملائم الفاظ اور میٹھے لہجے میں اتنی بات کہہ دی ——

" آپ کیوں ان کے ساتھ آنے کی تکلیف گوارا فرمائیں میں خود آکر شام کو انہیں لے جاؤں گا "۔

شاید بڑھیا کو اپنے مال کے "پکے پن" کا یقین تھا یا سکندر ہی اسے بٹاٹر نظر آیا ہو —— بہر حال وہ اس بات پر راضی ہو گئی کہ چاندنی اس کے ساتھ تنہا ہی جائے ——

وہ رات بجائے بارہ گھنٹوں کے بارہ صدیوں کے بعد آئی، اور سکندر نے کچھ یوں سوچا کہ ممکن ہے قیامت ایسے ہی آتی ہو ——!

سکندر نے اسے بے حد آرام دہ صوفہ میں لا کر بٹھایا۔ اور بہت قریب بیٹھ کر بالکل بچوں کے سے انداز میں ایک ٹک اسے گھورنے لگا۔ بچے ایسے ہی گھورتے ہیں نا کہ پلک تک نہ ماریں ——

ان بے چاروں کو بھلا محفل کے طور اطوار، آداب لحاظ کیا معلوم ——— وہ تو بس جس چیز پر نگاہ جم جائے دیکھتے ہی جاتے ہیں ——— اور سکندر بھی اس وقت اپنے جذبات کے ہاتھوں بچہ سا بن کر رہ گیا تھا، بڑی بے باکی، بڑی ملائمت، بڑے بھولپن سے اسے نگاہ بھر بھر کے دیکھے گیا ———،

چاندنی کھل کھل، کھل کھل کر کے بڑی شفاف ہنسی ہنس پڑی ———

"یوں کیا گھور رہے ہیں آپ؟"

"تم بڑی خوبصورت ہو ———" وہ بے حد سچائی سے بولا ———

"آپ کا تعریف کرنے کا انداز بھی خوب ہے ——" اور جیسے کانچ کی بہت سی چھوٹی چھوٹی کٹوریاں، بہت سی کٹوریوں سے ٹکرا گئیں؛

"مجھ سے شادی کر لو نا ———" سکندر بالکل اس انداز سے بولا۔ جیسے کوئی بچہ اپنے دوست سے بڑی معصوم سی بے تکلفی سے کہے ——— "اپنی یہ پتنگ مجھے دے دو نا"

چاندنی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ——— ذرا سا ہنسی۔ پھر بولی ———

"شادی کریں تو بچے ضرور پیدا ہوتے ہیں ———"

سکندر حیرت سے بولا

"پھر ——؟ یہ تو بے حد سہانی بات ہے ——"

وہ ہنس دیا ——

"اجی جناب ——" چاندنی نے بہت دور جاکر بات کا سلسلہ جوڑا —— "میں نے ایسی بھی خواتین دیکھی ہیں جن کا 'حسن'، ایک دو بچوں کے بعد ناف تک لٹکنے لگتا ہے، ظاہر ہے کہ میرا پیشہ ایسا ہے کہ جب تک جسم دیتا ہے پیسہ آتا رہتا ہے، بعد میں تو بس —— جی ہاں —— معاملہ ختم ——" وہ یک لخت بے خدا داس ہو گئی ——

سکندر مارے جوش کے دوسرے صوفے پر جا بیٹھا

"یہ تم کیا کہتی ہو جسم پیسے کا دروازہ ہے —— ایک رات پانچ ہزار ہی تو لیتی ہو نا ——؟ اب تم ذرا حساب جوڑ کے مجھے بتاؤ کہ اندازاً تمہاری عمر کتنی ہے اور ابھی آگے کے دن زندہ رہنے کا سوچ سکتی ہو —— چلو زندگی بھر، پانچ ہزار روپے روزانہ کے حساب سے دے دیئے تمہیں، سنہری سکے ——"

چاندنی بے حد بھرپور ہنسی ہنسی —— "جناب چار دن بعد جب عشق کا خمار اترے گا اور حضور ٹھنڈے پڑ جائیں گے تو پانچ ہزار تو کدھر —— پانچ نئے پیسے بھی پھینک کر نہ ماریں گے۔"

سکندر جھلا کر بولا —— "یہ غلط ہے۔"

"ہونہہ غلط ــــــ ؟" وہ پھر ہنسی ــــــ "جب تک یہ کھال آئینے کی طرح چمکتی ہے اور جب تک یہ جسم تنا ہوا رہتا ہے۔ تب ہی تک مرد کی محبت بھی قائم رہتی ہے۔ ورنہ تو بس۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ پہلی بار بگڑ بیٹھی

"آپ یہ سب سنانے کے لئے ہی مجھے یہاں لائے یا کچھ سننے کا بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

سکندر چاپلوسی سے بولا

"آج تو وہ سب کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے جو تم نے اپنے دل سے شعر میں جوڑا تھا ــــــ یاد ہے نا ــــــ ؟"

اور سکندر نے ہاتھ بڑھایا کہ اسے اپنے قریب کر لے۔

چیں ــــــ ایں ــــــ اوں ــــــ باہر آؤٹ ہاؤس سے کسی مریل سے بچے کے رونے کی آواز آئی اور سکندر جھلا گیا ــــــ

اک دم وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا، باہر دو ایک منٹ جھانکتا رہا، پھر گرجتا ہوا واپس آکر صوفے میں دھم سے گر پڑا ــــــ

"کم بخت نے چین حرام کر دیا ہے جب دیکھو تب چیں ــــــ چیں ــــــ چیں ــــــ پلّے کو اٹھا کر پھنکوا نہیں دیتیں اماں جی ــــــ"

چاندنی نے از خود پہلی بار بات کی ــــــ

"آپ حیدر آباد کے نواب ہیں ـــــ؟"

سکندر نے اس کی طرف ذرا حیرت سے ہنس کر دیکھا، پھر بولا ـــــ

"کیوں ـــــ؟ ـــــ تمہیں کیونکر احساس ہوا ـــــ؟" پھر خود ہی بولا ـــــ

"نواب تو خیر کیا ہوں، ہاں بھگوڑا ضرور ہوں۔"

"بھگوڑا ـــــ!"

چاندنی حیرت سے ہونٹ دبانے لگی۔

"ہاں الیکشن کے وقت کچھ عقل ساتھ دے گئی ـــــ تھوڑا بہت اثاثہ حضور ابا مرحوم کا پاس تھا، لے کر بمبئی بھاگ کھڑا ہوا ـــــ اماں جی کو بھی ساتھ لے آیا ـــــ اوپر والے نے قسمت میں آرام لکھ دیا تھا نا ـــــ کاروبار میں وہ ترقی ہوئی کہ بس نوابی پیچھے پڑ گئی، اور ایسی ایسی کوٹھیاں خدا نے دے دیں کہ حیدر آباد میں رہ کر خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ کبھی ملیں گی ـــــ"

وہ رکا، ـــــ

لیکن تمہیں یہ سوال کیسے سوجھا؟ کیا بات چیت سے میں حیدر آبادی لگتا ہوں ـــــ؟ میری اماں جی تو یو، پی، کی ہیں ـــــ!"

وہ ہنس دی ـــــ "نہیں، یہ بات نہیں

دراصل آپ کا خاندانی دبدبہ اور گھمنڈ برسنے کی ادا۔"
وہ پھر کھل کھلا کر ہنسی ———
"غریبوں کے بچوں کو محض رونے کی سزا یہ کہ اٹھا کر پھینکوا دیئے جائیں، صرف نواب ہی دے سکتے ہیں ———"
اس نے قدرے رک کر، بڑی ادا سے سر اٹھا کر پوچھا ——— "کیوں غلط کہا میں نے؟"
سکندر بے حد جھلا اٹھا ———؛
"قسم خدا کی ——— حد ہو گئی ——— جس رات کو سہاگ رات کی طرح حسین اور خوشگوار ہونا چاہیئے تھا، وہاں کس درجہ بدذوقی ہو رہی ہے ——— کوئی تک ہے بھلا ———؟"
چاندنی تنک کر بولی ———
"واہ ——— یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آج کی رات سہاگ رات تھی ———؟ آپ کس وعدے پر مجھے یہاں لائے ہیں ———؟ گیت سننے اور رقص دیکھنے کے وعدے پر نا ———؟ آپ تو تیسری ہی بات سوچ رہے ہیں ———!"
"اور جو میں زبردست بن جاؤں؟"
چاندنی اسی اطمینان سے بولی ——— "میں ایسا سمجھتی ہوں کہ دو مرد مل کر تو ایک عورت کو زیر کر سکتے ہیں

لیکن ایک مرد..... ہونہہ!"

اس نے کچھ حقارت اور نفرت سے سکندر کو دیکھا۔

سکندر ہنسا۔۔۔۔۔؛

"نام کا ہی سکندر نہیں ہوں، قسمت کا بھی ہوں، وہ جس نے سارا ہندوستان فتح کیا تھا......"

"ضروری نہیں کہ عورت کے دل کو بھی فتح کر سکے" چاندنی نے جملہ پورا کر دیا۔۔۔۔۔۔

"اوں۔۔۔اوں۔۔۔ایں۔۔۔۔" پھر اسی آواز نے بات کا سلسلہ ختم کر دیا۔۔۔۔۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر سکندر گویا ہوا۔

"اماں جی کو بڑا شوق ہے بچے پالنے کا۔۔ کتے کے بچے، بلی کے بچے، خرگوش کے بچے۔۔۔۔اس کے بچے، اس کے بچے۔۔۔۔۔"

اس کے اندازِ بیان پر چاندنی کو ہنسی آنے لگی وہ ساتھ ہی ساتھ گنگنانے بھی لگی تھی۔۔۔۔سکندر ذرا جوش سے اٹھ بیٹھا۔۔۔۔۔

"ظاہر ہے انسان کے بچے۔۔۔۔۔ یعنی میرے بچوں کی بھی انہیں تمنا ہوگی ہی۔۔۔۔ لیکن جسے انہوں نے پسند کیا۔۔۔۔۔ اس نے مجھے ناپسند کر دیا۔۔۔۔"

اس نے بڑے معنی خیز انداز سے چاندنی کو ہنس کر دیکھا اور ہنس کر ذرا بے باکی سے اپنا ہاتھ بڑھایا۔۔۔۔۔

چاندنی خطرہ بھانپ کر کچھ پیچھے ہٹی اور دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لئے ــــــــ

سکندر خالص بدمعاشی کے موڈ میں تھا ــــــ لپک کر بولا ــــــ "چاند، داغ جی کی چیز ہو جائے ع

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

چاندنی کسمسا کر بولی ــــــــ

"یہ باتیں کوئی اچھی باتیں ہیں ــــــ؟ اب میں آپ سے صفا صفا کہتی ہوں کہ میرے مذہب میں جسم کو ہاتھ لگنے دینا حرام ہے"

"ہٹاؤ بھائی جسم و سم کے جھگڑے کو ــــــ مجھے احتراماً صرف جنت کے کنگوروں کو چھونے کی اجازت دے دو"

چاندنی ڈھیٹ بن کر بولی ــــــــ

"کنگورے، برجیاں، گنبد، سنگِ مرمر کی چٹانیں یہ سب چیزیں ناقابل حصول ہیں حضور ــــــ بس کیجئے نظارہ دور دور سے ــــــــ"

وہ گنگنانے لگی ــــــ گنگناتے گنگناتے وہ سنجیدہ ہو کر بولی ــــــ

"دیکھئے سکندر صاحب ــــــ میں جس انداز سے سوچتی ہوں آپ نہ سوچ پائیں گے ــــــ اپنی ماں کا حشر میرے سامنے ہے ــــــ اپنی خالہ کا حالِ تباہ میں نے دیکھا ہے ــــــ میری کئی جان پہچان والیاں ہیں

جنہوں نے جسم کی تجارت کی، نتیجہ میں انہیں کیا ملا ــــــــ؟
مرد کی ذات بے حد کمین ہوتی ہے ــــــــ وہ صرف دو
لمحہ کی لذت کے بارے میں سوچتا ہے، اس کے لئے اتنے
جتن کرتا ہے، ہزاروں لاکھوں تک لٹانے سے نہیں چوکتا
ــــــــ عورت کو چوس چوس کر پھوک بنا دیتا ہے
ــــــــ دنیا میں سارا جھگڑا پیٹ اور پیسے کا ہے ــــــــ آپ
آج میرے جسم کی خوب صورتی سے مسحور ہو کر مجھ سے،
شادی تک کرنا چاہتے ہیں، لیکن چار چھ راتوں میں ہی جب
میرا کس بل نکل جائے گا، میں قدموں تلے کی دھول بنا
دی جاؤں گی ــــــــ،

میں ممکنہ حد تک جوان رہنا چاہتی ہوں کہ زندگی
کا کچھ تو مزہ لے سکوں ــــــــ جسم کا سودا کر دوں گی تو ربڑ
کے ہوا نکلے ہوئے غبارے کی طرح میرا حشر ہو جائے گا
ــــــــ ورنہ دل تو کیا کیا نہیں چاہتا ــــــــ اور کیوں
نہ چاہے ــــــــ کیا عورت نہیں ہوں ــــــــ؟"

وہ تنا کے ساتھ اٹھی
ــــــــ

"جئے آپ کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہیں، اور
ساتھ ہی میرا دماغ بھی خراب کر رہے ہیں ــــــــ مجھے
نہ چاہئیں آپ کے پانچ ہزار دس ہزار ــــــــ مجھے جانے
دیجئے ــــــــ پانچ ہزار کی میرے پاس کیا اوقات ہے
ــــــــ اسی رات جب آپ سے پہلی بار بھینٹ ہوئی

ہے، میں نے بجائے پانچ کے ساڑھے سات ہزار بنا لیے تھے آپ اتراتے کس بات پر ہیں ؟"

"واہ بھئی واہ ـــــ تم عورت ہو کہ پٹاخہ ـــــ پٹ پٹ بولے ہی چلی جاتی ہو ـــــ تمہیں تقریر کرنے کو تو نہیں بلایا تھا"

"تو گانا سنئے ـــــ رقص دیکھئے ـــــ لیکن جو میری راہ نہیں اس پر نہ چلوایئے ـــــ"

سکندر ذرا کمینے پن سے ہنسا ـــــ "یہ ساری باتیں یہاں تک تو ٹھیک ہیں ـــــ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ تم اتنی رات گئے ایسی تنہائی میں ایک مرد کے ساتھ اکیلی ہو ـــــ تو ..... ؟"

اس نے ادا کے ساتھ مصرع پڑھا ع

"عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

یہ آپ اچھی طرح سوچ رکھیں کہ میں ایک ہی نظر میں بھانپ لیتی ہوں کہ کون مرد کس قماش کا ہے، اور جب مجھے خطرہ نظر آئے تو میں تنہا قدم نہیں اٹھاتی ـــــ آپ کا ارادہ کیسا بھی سہی، میں رنڈی سہی، تنہا سہی، لیکن اتنا پھر بھی یقین ہے کہ آپ دست درازی نہیں کریں گے ـــــ مجھے خون کی پہچان ہے ـــــ"

وہ صوفے پر نیم دراز ہو گئی ـــــ"

"نیند ہے کہ کم بخت آئے جا رہی ہے اور آپ ہیں

کہ بس —"

اس نے ہنس کر انگڑائی لی ——————

سکندر نے نئے نئے رو کھے ہوئے دولہے کی طرح منہ پھیر لیا،

چاندنی نے بغیر ساز کے ایک گھریلو لوری گنگنانی شروع کر دی —— سکندر کے اندر کا سرکش مرد میٹھی میٹھی مدھر تان سنتا سنتا سونے پر آگیا ——

چیں — ہان — ہان — اوں — آن ——

باہر سے پھر اسی سریلی سی آواز نے مداخلت کی اور سکندر سوتا پھر اٹھ گیا، اور اب کی بار ایسا بھنایا کہ دروازہ کھول کھٹاک سے باہر ——،

واپس پلٹا تو اس کے ہاتھوں میں چیں چیں کرتا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ وہ تیزی سے اسے لئے لئے اندر گھس ہی رہا تھا کہ چاندنی تیزی سے بھاگ کر اس کی راہ میں آگئی ——،

" غصہ میں مار ہی ڈالیں گے کیا آپ —؟"

" نہیں، اماں بی کے حوالے کر رہا ہوں، یا تو اسے سنبھالے لے یا اپنے ہاتھوں مار ہی ڈالے —— قسم خدا کی کوٹھیوں میں یہ آؤٹ ہاؤسس والا سسٹم ہونا ہی نہیں چاہیئے —— اور پھر ان کم بختوں کو اتنی تمیز بھی تو نہیں کہ دور لے جا کر بہلائیں —— یہیں میری

ناک کے پاس ہی لے کر ٹہلیں گے ... ...''

ڈر سے کانپتا، مگر محبت سے مجبور مالی اسی دم کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا اور روتا ہوا بولا

" کا کریں سرکار، گھروالی کو مرے ہوئے دن ہی کتے ہوئے رہیں، بچہ ہی کی تو بات ہے، نہ اوپر کا دودھ منہ میں پکڑے نہ بہلائے بہلے ــــــ ہم تو مجبور ہو گئے بے چاری دھوبن بہلائے تو ذرا دیر سو جائے، تنک سو کر وہی ٹھاں ٹھاں ہے ــــــ ہم تو ہار گئے"

" ہار گئے ہو تو اسے زہر پلا کر ختم کر دو ــــ یا پھر لے جاؤ بڑی بیگم صاحب کے پاس ــــ وہی کچھ بندوبست کریں گی ــــ"

اس نے گیند کی طرح بچّے کو اچھالا ــــــ "لے جاؤ یہاں سے ــــ!"

اک دم چاندنی نے بچے کو ہاتھوں پر جھیل لیا۔

ڈرے ہوئے جو ہے جیسے بچے نے اور زور سے چیخیں مارنی شروع کر دیں ــــ،

جس کمرے کو رقص و سرور سے پائل کی چھم چھم اور دھڑ تانوں سے گونجنا تھا، وہاں بے وقت کی بھیرویں ہو رہی تھی ــــــ،

جب اس کی روں روں کسی طرح نہ رکی تو چاندنی نے اسے سفید سفید بانہوں میں بے حد

باہرانہ انداز سے جھکولے دیے، اور صوفہ کے ایک
کونے پر ٹک کر، اپنے بلاؤز کے بٹن کھول کر بے
حد محبت اور پیار کے ساتھ اپنی گوری گوری اور تنی
ہوئی چھاتی اس کے منہ سے لگا دی۔

سکندر نے حد درجہ حیرت کے ساتھ دیکھا۔

"ارررر..... تم؟ ___ تم تو ___ غالباً کنواری
ہو ___، تمہارے دودھ اترے گا؟ اور تمہارے
....."

چاندنی نے بات کاٹ دی ___ "تم کیسے مسلمان ہو
تمہیں بی بی مریم کی داستان بھی نہیں معلوم ___؟ خدا
بغیر شوہر کے بچہ دے سکتا ہے تو بغیر بچے کے دودھ
کیوں نہیں دے سکتا ___؟"

سکندر نے حیرت سے دیکھا، دیکھتا ہی رہا ___ اس
وقت چاندنی کے چہرے پر دنیا بھر کی ماؤں کا نور ایک
ساتھ جھلک رہا تھا ___

پہلا گناہ

میں رونا چاہتی ہوں ______،

میں رونا چاہتی ہوں، لیکن آنسو جیسے خشک ہو کر رہ گئے ہیں، ہوائی ڈاک سے ملنے والا یہ نیلا لفافہ میرے ہاتھوں میں کانپ رہا ہے۔ ابھی ابھی میں نے باریک کاغذ پر لکھا ہوا یہ خط اس لفافہ میں سے نکال کر پڑھا ہے اور میں جیسے سن ہو کر رہ گئی ہوں:

اس لفافے کے اندر ایک چیک بھی رکھا ہوا ہے اتنی بڑی رقم کا چیک کہ کسی کے نصیب بدل جائیں، لیکن میں سوچ رہی ہوں اس چیک اور ان ہزاروں روپوں کو پا کر میں خوش کیوں نہیں ہوں؟

میرے دل پر بجائے خوشی کے یہ بوجھ کیسا ہے؟ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا خط کانپ رہا ہے۔

"بیٹا بی بی، دوپہر کے لئے کیا پکے گا؟"
رسول بابا مجھ سے کچھ پوچھ رہے ہیں، میں گھبرا کر سر اٹھاتی ہوں۔

میں ان سے کیسے نظریں ملاؤں؟

"جو بھی آپ مناسب سمجھیں بابا ——" میں فوراً اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیتی ہوں۔

"نہیں نہیں ——میں بابا سے آنکھیں چار نہیں کر سکتی"

میں اپنے آپ کو سناتی ہوں

بابا ایک معصوم سی مسکراہٹ چہرے پر لئے پلٹ کر کچن کی طرف جا رہے ہیں،

"بیٹا تو مجھی پر ٹال دیتی ہیں، لو بھئی اب کیا پکواؤں؟ چلو ٹھیک ہے، بابا لوگ کے لئے پھیکا آلو گوشت فیرنی ...... صاحب کے اور بٹیا کے لئے......

ان کی آواز، ان کے قدموں کی چاپ کے ساتھ دور جا کر ڈوب جاتی ہے اور مجھے بہت پہلے کا —— بہت سال پہلے کا ایک دن یاد آجاتا ہے .. .. ..

بے پناہ سردیوں کے دن تھے۔ صبح کے کوئی دس بج رہے تھے۔ ہم لوگ ہیٹر سے دہکتے ہوئے گرم گرم ڈائننگ ہال میں ناشتہ کرنے بیٹھے تھے۔

ٹیبل، کھانے کی طرح طرح کی چیزوں سے لدا ہوا

ہوا تھا، چائے دانی میں چائے اور پھر کو بیٹر میں گرم اگرم کافی ڈھکی رکھی تھی۔

اسی دم آپا ڈائیننگ ہال میں داخل ہوئی اور ذرا ڈرتے ڈرتے بولی "میم صاحب باہر کوئی بھکاری کھڑا ہے"۔

" بھکاری کھڑا ہے تو ہم سے بتانے کا مطلب ؟"

وہ کچھ جھلا کر بولے " کچھ دے دلا کر رخصت کر دو"

" جی ..... " آپا کچھ ہچکچاتی ہوئی بولی۔ " وہ کہتا ہے مجھے خیرات کی ضرورت نہیں ہے"۔

" خیرات کی ضرورت نہیں ہے " وہ غصہ سے بولے " پھر یہاں تشریف لانے کا مقصد ؟"

" افوہ ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنا غصہ کیوں ہو جاتے ہیں"

میں انہیں کچھ منانے کے کچھ ڈانٹنے کے انداز میں بولی

" جاؤ آپا تم اس سے پوچھو تو وہ چاہتا کیا ہے"۔

وہ ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ میں نے ان کا دھیان بٹانے کی خاطر خشک میوے کی پلیٹ ان کے آگے رکھ دی۔

آپا تھوڑی دیر بعد نمودار ہوئی اور بولی " میم صاحب وہ تو عجیب ڈھیٹ سا آدمی ہے، کہتا ہے بی بی سے خود بات کر لوں گا۔

انہوں نے غصے سے آپا کی طرف دیکھا، لیکن ان کے

کچھ کہنے سے قبل ہی میں آپا کو حکم دے چکی تھی "اسے یہاں لے آؤ۔"

ڈھیلے ڈھالے میلے کپڑے، سفید بالوں سے بھرا سر، ملگجی داڑھی، سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھ پاؤں، بڑی بڑی آنکھیں، جن میں بیچارگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی بے حد کانپتی اور لرزتی آواز میں اس نے بغیر کسی کو مخاطب کئے ہوئے کہا۔

"اسلام علیکم!"

سلام کا جواب دے کر میں نے بے حد نرمی سے سوال کیا۔

"تمہیں کیا چاہیئے بابا؟"

"ٹھکانہ۔"

انہوں نے بہت مختصر سا جواب دیا۔

"ہم نے کوئی لنگر خانہ تو نہیں کھول رکھا ہے"، وہ بجد تلخی سے بولے "ٹھکانہ، ہونہہ!"

"وقت بری چیز ہے بیٹا ورنہ آپ یوں نہ دھتکارتے" وہ مڑے، ہلکی آواز میں خدا حافظ کہہ کر جانے ہی کو تھے کہ میں جلدی سے بولی۔

"بابا سنو تو ____!"

بابا نے اور "انہوں" نے ایک ساتھ مجھے سر اٹھا کر دیکھا، ایک کے چہرے پر آنے والی خوشیوں کا تاثر، دوسرے کے چہرے پر غصہ کی چھاپ!

"بابا کیا تم باغ کی دیکھ بھال کر سکتے ہو؟"

"بٹیا، وقت نے ہر کام کا عادی بنا دیا ہے، مالی، دھوبی باورچی، میں سب کچھ بن سکتا ہوں، بس دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کے لئے ایک ٹھکانہ چاہیئے"

"اب تک کہاں رہتے رہے؟" انہوں نے بیچ میں ایک سوال اور کر ڈالا۔

"اُفوہ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایسے غیر ضروری سوال کیوں کرتے ہیں۔ بھلے سے وہ کہیں بھی رہے ہوں، ہم سے مطلب؟" میں ذرا دھیرے سے بولی

"بھئی تم سمجھتی نہیں ہو" وہ اب کی بار انگلش میں بولے "اس قسم کے لوگ سخت خطرناک ہوتے ہیں۔ عموماً ڈاکوؤں سے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہمدردی حاصل کر کے گھر لٹوا دیتے ہیں، تم اپنے بھولپن سے کبھی نہ کبھی دھوکا کھاؤ گی"

بڑی فصیح اور شستہ انگلش میں بابا نے دھیرے سے کہا "آپ کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی"

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ہاتھ جوڑے ہوئے اُن کے چہرے پر خفگی اور ندامت کا ملا جلا تاثر تھا، ڈائننگ ہال سے باہر جاتے ہوئے وہ بول گئے۔

"شوبی یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے"

اس گھر کا تو ہر معاملہ ہی میرا اپنا ہے، اور ظاہر ہے بہ حسن وخوبی میں ہر ایک کو ہی کامیابی سے سلجھا لیتی ہوں۔ میں نے سوچا اور طے کر لیا کہ اس مظلوم روح کو بہر حال مجھے سکھ

دینا ہی ہے، میں جلدی سے اٹھی، اندر والے کمرے میں آ کر "اُن" کی الماری کھول کر میں نے دھوبی کے ہاں کا دھلا صاف کرتا پاجامہ نکالا اور ایک تولیہ لے کر برآمدے میں آ گئی، جہاں بابا سکڑے سمٹے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"لو بابا، تم پہلے جا کر نہا کر یہ کپڑے بدل ڈالو، اس کے بعد ناشتہ کر لو۔۔۔۔۔" ذرا رک کر میں نے پوچھا "ویسے تمہارا نام کیا ہے بابا؟"

"محمد رسول" انہوں نے دھیرے سے جواب دیا۔

میں ایک دم ٹھٹھک سی گئی۔ سہمے ہوئے انداز میں بولی "دیکھو بابا تمہارا نام تو اس عظیم اور پاک شخصیت کا نام ہے کہ جسے یہ گناہ گار زبانیں ادا کرنے کی اہلیت اور ہمت تک نہیں رکھتیں، ہم اگر تمہیں صرف بابا ہی کہیں تو؟"

"کوئی فرق نہیں پڑتا بٹیا۔ انسان کے اعمال اس کے اپنے ساتھ ہوں، بس..... غسل خانہ کدھر ہے بٹیا"

"آپا، بابا کو لکس کی ایک ٹکیہ دے دو اور سرونٹس کوارٹرز کی آخری والی کوٹھری صاف کرا دو"

آپا کے ساتھ بابا کو غسل خانے بھجوا کر میں لونگ روم میں آئی تو وہ قدرے مسکرا کر بولے "تو آپ نے پوری ہسٹری معلوم کر لی۔"

"صورت سے تو بے چارے بڑے نیک معلوم ہو رہے ہیں، نام بھی کتنا مبارک اور مقدس ہے، محمد رسول۔"

میں بچوں کی سی خوشی سے بولی " لیکن ہم انہیں ان کے نام سے
نہیں پکاریں گے بے عزتی ہوتی ہے نا ؟ اور ویسے بچپن میں
ہمیں مولوی صاحب نے بتایا بھی یہی تھا ...."

ایک دم وہ ہنس پڑے " شوبی، تم دو بچوں کی ماں
ہو کر ابھی تک کتنی چائلڈش ہو "

" افوہ !" میں تنک گئی " آپ بھی بس عجیب و غریب آدمی
ہیں، یا تو غصے رہیں گے یا بس مذاق کئے جائیں گے "

" ارے بھائی میں غصہ وصہ کبھی نہیں رہتا، اصل میں
تم میں اتنا بچپنہ بھرا ہوا ہے کہ مجھے ہر بار تمہیں گائیڈ کرنا
پڑتا ہے، سمجھانا پڑتا ہے اور تم سمجھتی ہو کہ میں غصیلا ہوں "

" چھوڑیئے اس غصہ پنے کی بات کو، اس وقت میں بہت
خوش ہوں "

" میں بھی تو سنوں، آخر کیوں ؟"

" ارے بس یونہی ـــــ شاید یہ بابا کے آجانے کی وجہ
ہو ـــ "

" تم نے تو آگے ہی نوکروں کی فوج لگا رکھی ہے، بابا کے
آجانے سے کیا نئی بات ہو گئی ؟"

" آپ سمجھتے تو ہیں نہیں، میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ
گھر میں اچھے اچھے ناموں والے ملیں ہوں تو بڑی برکت
رہتی ہے "

وہ خوش دلی سے مسکرائے " اچھا میں آپ سے ایک

سوال کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کے فضل سے اس گھر میں کون سی برکت نہیں ہے؟ روپیہ پیسہ عزت، نوکر چاکر، گاڑیاں، فون فرج، عیش و آسائش کی ہر چیز پیاری سی ایک گڑیا، ایک ننھا منا گڈا، اور ایک ... ... " وہ شرارت سے مسکرائے "اس جنت میں ایک پاکیزہ حور!"

"افوہ بس لگے بنانے ____؟" اور میں ان کے شریر تیور دیکھ کر فوراً کمرے سے باہر نکل گئی۔

بابا کے نہا کر آنے تک میں نے ورانڈے میں ایک چٹائی بچھوا کر ان کے لئے ناشتہ لگوا دیا۔ گرم گرم چائے، سینکے ہوئے ٹوسٹ، مکھن، جام، میوے، آملیٹ، پراٹھے اور حالانکہ اس وقت فیرنی کی کوئی تک نہ تھی لیکن چونکہ فرج میں موجود تھی اس لئے ایک طشتری میں وہ بھی۔

بابا نہا کر آئے تو بالکل بدل گئے، سفید پاجامے اور کرتے میں خاصے معزز معلوم ہو رہے تھے، سر کے بلگجے بال اور میلی داڑھی نکھر کر جھاگ کی طرح سفید ہو رہی تھی۔ گرم گرم پانی سے ان کی چھپی ہوئی گوری رنگت سرخ ہو گئی تھی ____

"بابا تم سب سے پہلے کچھ کھا لو"، میں بڑے پیار سے بولی۔

سفید دسترخوان پر اتنی ساری چیزیں دیکھ کر وہ ذرا خائف سے ہو گئے ٹھٹھک کر بولے۔

"یہ..... یہ...."

"ہاں بابا" میں محبت سے بولی "یہ میں نے تمہارے ہی لئے لگوایا ہے، کھاؤ نا"

"بٹیا..." وہ ذرا جھجکتے ہوئے بولے "آپ.... آپ روز ایسے ہی کھایا کرتی ہیں؟"

"ہاں، ہاں — کیوں؟" میں حیرت سے بولی

"اور..... اور مجھے بھی یہی سب کچھ ملا کرے گا؟"

میں ہنس پڑی — "ارے بابا، خدا نے اگر دیا ہے تو، تمہیں کیوں نہیں دوں گی، تمہیں پتہ ہے بابا غریبوں کو کھلانے سے خدا چوگنا دیتا ہے، میں تو اپنے سبھی نوکروں کو وہی دیتی ہوں جو میں خود کھاتی ہوں"

انہوں نے بڑے غم اور بے چارگی بھرے لہجہ میں پوچھا "بٹیا، آپ مجھے نکالیں گی تو نہیں؟"

پتہ نہیں کہاں سے گرم گرم آنسو میری آنکھوں اور حلق میں ابل آئے، میں بڑی مشکل سے بولی

"بابا تم نے مجھے بٹیا کہا ہے نا — کبھی کسی بیٹی نے آج تک اپنے باپ کو دھتکارا ہے؟"

"نہیں بٹیا ایسی بات نہیں مگر.... سرکار کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں"

"ارے بابا...." میں قائل کرنے کے انداز میں بولی جیسے ان سے بڑی پرانی بے تکلفی ہو — "تمہیں معلوم

نہیں وہ دل کے بڑے اچھے ہیں، دل میں کوئی بات تو رکھتے ہی نہیں، مگر بابا آج کل کا زمانہ اچھا نہیں ہے نا، تو وہ مجھے ذرا سمجھاتے رہتے ہیں، ارے بابا....."

میں بات ادھوری چھوڑ کر چلائی " تم ناشتہ تو کر لو پہلے....."

بابا دسترخوان کے کنارے بیٹھے، ہاتھ اٹھا کر آنکھیں بند کر کے دعا مانگی ــــــ؛

"اے رب العالمین تو مجھے ان نعمتوں سے اب کبھی محروم مت کرنا ــــ"

ان کی پلکیں آنسوؤں کا بوجھ سنبھالنے میں ناکام، ہو گئیں تھیں۔

میں نے دکھے دل سے اسی دم طے کر لیا کہ یہ شخص اگر مجھے دھوکہ دے تب بھی میں اسے کبھی نہیں نکالوں گی ــــ کبھی نہیں ــــ چاہے کتنا ہی بڑا گناہ کرے!

اور میں اپنے عہد پر قائم رہی
دھوکا کھانے کے باوجود!

چند ہی دنوں میں بابا ہمارے گھر میں رل مل گئے کہ پتہ نہ چلتا کہ یہ ہمارے خاندان کے ایک فرد نہیں ہیں۔

میرے دونوں بچے بھی ان سے یوں مانوس ہو گئے جیسے وہ ان کے سگے نانا یا دادا ہوں۔ گڑیا تو سمجھدار تھی، لیکن چھوٹا جو ابھی سال بھر کا بھی نہیں تھا، آپا کو چھوڑ کر انہی کا ہو رہا۔

بمشکل ایک ماہ ہوا ہو گا کہ سارے گھر میں بابا کی عمل داری ہو گئی ——

نوکر تو نوکر، ہم دونوں بھی بابا کے زیر اثر آ گئے، باغ ہے تو بابا کی نگرانی میں، کچن ہے تو بابا کی تحویل میں، کیا پکے گا کیا نہیں، سب بابا کرائیں گے، کسی کی دعوت ہے تو سارا انتظام بابا کر رہے ہیں ہم کہیں جا رہے ہیں تو سارا گھر بابا سنبھال رہے ہیں۔

اور تو اور ریاض (میرا دیور) جو ہمیشہ گھر میں، اکھڑا اکھڑا سا، لئے دیئے رہتا، وہ بھی بابا کا گرویدہ ہو گیا۔

ریاض کو میں نے بہت کم ہنستے بولتے دیکھا تھا میں بیاہ کر آئی تو سسرال میں صرف ساس تھیں، خسر پہلے ہی انتقال کر چکے تھے، اماں کے دو ہی لڑکے تھے، یہ اور ریاض، ان کی ساری زندگی ان کے اپنے ہاتھوں بنائی ہوئی تھی

کبھی پرانی باتوں کا ذکر نکلتا تو یہ بڑے فخر سے کہتے کہ میں سیلف میڈ مین (self made man) -

ہوں۔ شادی کے بعد دو برس بعد اماں دل کے دورے میں ختم ہو گئیں تو ریاض بالکل ہی تنہا رہ گیا۔

کیونکہ یہ ریاض سے کوئی خاص خوش نہ تھے، ہمیشہ کہا کرتے کہ اس لڑکے میں اسٹرگل اور جدوجہد کی اسپرٹ ہی نہیں ہے، اس عمر میں میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا، بی، ایس، سی کرنے کے بعد ویسے وہ بے چارہ کئی کئی جگہ کوشش کر چکا تھا لیکن قسمت کے دروازے ابھی تک اس پر نہ کھلے تھے،

میں اپنے طور پر ان سے کئی بار کہہ چکی تھی کہ نوکری نہیں لگتی نہ سہی، آپ بھی تو بڑے بھائی ہیں۔ آپ پر بھی اس کا کچھ حق ہے، اپنے پاس سے دس، پانچ ہزار روپیہ لگا کر اسے کوئی چھوٹا موٹا بزنس ہی شروع کروا دیجئے۔ یہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے تھے ــــ !

"اس طرح دوسروں کی مدد ملتے رہنے کا چسکا پڑ جائے تو انسان کاہل اور آرام پسند ہو جاتا ہے۔ ترقی اور جدوجہد کی راہیں بند ہو جاتی ہیں"

ویسے مجھے اپنے طور پر ریاض سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ لیکن اپنے بھیا کے ڈر کی وجہ سے وہ مجھ سے بھی دبا دبا رہتا تھا۔ حالانکہ میں نے اس سے بے تکلفی کی فضا ہمیشہ قائم رکھی تھی۔ ویسے مجھے اس پر کچھ

عجیب سا ترس آیا رہتا، ایسے میں جب اسے بابا کی شکل میں ایک دوست سا مل گیا تو مجھے بڑا سکون ملا۔

ایک دن یونہی میں نے انہیں چھیڑنے کی خاطر کہا۔

”آپ تو بابا سے کس قدر بدگمان تھے، اور حالانکہ بیچارے اتنے سوئٹ بڑے میاں نکلے،،

انہوں نے کچھ نہ کہا — ! کہتے بھی کیا ہنس کر سر جھکا لیا کچھ ندامت سی چہرے پر چھا گئی۔

لیکن اس واقعہ کے دوسرے ہی دن میرا سر جھک کر رہ گیا —

شاید زندگی بھر کے لئے —

اس دن ہم ایک پارٹی میں مدعو تھے۔ میں نے بھرپور سنگار کیا تھا۔

شہر کے سب سے بڑے بزنس مین کے ہاں پارٹی تھی۔ ایسے موقعوں پر آن بان کے ساتھ کچھ مقابلے کا بھی سوال آجاتا ہے، اسی لئے میں نے اپنے بہترین کپڑے سب سے اعلیٰ زیور اور سب سے قیمتی گہنے پہنے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

رات گئے جب ہم پارٹی سے لوٹے تھے تو میں نے اپنے زمرد جڑے کنگن سامنے یونہی ڈریسنگ ٹیبل پر ڈال دیئے تھے۔ سوچا تھا اتنی رات گئے کہاں سیف کھولتی پھروں، جڑاؤ گلوبند، جھمکے، انگوٹھیاں وغیرہ تو الماری میں رکھ دیئے

تھے، کنگن اتارنا ہی بھول گئی۔ اور جب اتارنا یاد آیا تو وہ بولے ــــ

"ابھی مت اتارو، اتنے خوب صورت ہاتھ لگ رہے ہیں، تھوڑی دیر میں اور دیکھ لوں تو ــــــــ"

عورت کو ایسی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ملتی رہیں تو اس کی جوانی سدا بہار ہو کر رہ جاتی ہے

ویسے بھی وہ کنگن انہیں بہت پسند تھے اور انہی نے پورے چھ ہزار میں میرے لیے شادی کی پہلی سال گرہ پر خرید کر تحفہ دیے تھے۔

میں نے کنگن ہاتھوں ہی میں رہنے دیئے، رات گئے۔ جب میں نے مسہری پر لیٹے لیٹے سرہانے کی لائٹ آف کرنے کو ہاتھ بڑھایا تو مجھے کنگن جھمکتے دکھائی دیئے۔

ارے، کہیں نیند میں، سوتے میں ایک دو زمرد جھڑ گئے تو خواہ مخواہ اتنے پیارے کنگن برباد ہو جائیں گے۔ میں نے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کا اور بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کا کنگن اتارا اور دونوں وہیں آئینے کے سامنے رکھ دیئے۔

ــــ اور بھول گئی۔

صبح ناشتے کے بعد ڈائننگ ہال سے اپنے کمرے میں آئی تو اچانک جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ جائے میں نے آئینہ کے سامنے دیکھا، وہاں کچھ بھی نہ تھا، ہر

شیڈ کی لپ اسٹک کی ایک قطار، پوڈر کریم کے ڈبے۔ کنگھے کلپ، ہیرپن، ہیئر اسپرے، سینٹ کی چھوٹی بڑی شیشیاں، مگر کنگن نہیں تھے۔

"کنگن آپ نے اٹھائے ہیں؟"

میں نے مڑ کر ان سے پوچھا، جو میرے پیچھے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

"نہیں تو" وہ گھبرا سے گئے۔

"پھر کنگن کیا ہو گئے ــــــ؟"

میں نے جلدی جلدی ہر چیز کھول کر دیکھ ڈالی، کہیں بھی کنگن کا نام ونشان نہ تھا۔ یہاں سے وہاں تک ڈھنڈائی پڑ گئی۔

نوکروں کو بلوایا گیا، سب نوکر حاضر تھے، برسوں کے نوکر تھے کسی پر شبہ کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا، لیکن پوچھنا تو ضروری تھا ہی۔

بابا کی باری آئی تو پتہ چلا کہ وہ کوٹھی میں موجود ہی نہیں ہیں۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

اس لئے نہیں کہ نامراد زمرّد کے کنگن چوری ہو گئے بلکہ اس لئے کہ وہ اعتماد اور یقین میں نے کھو دیا جو مجھے بابا کی ذات پر تھا۔

دل کہتا تھا یقین نہ کروں لیکن رہ رہ کر ان کی نگاہیں اور ان میں بھری چبھن مجھے بے کل کر دیتی تھی۔

شام بڑے بابا لوٹے تو میرے دھڑکتے دل کو قرار آگیا، اگر یہ چوری کر کے بھاگے ہوتے تو پلٹ کر کیوں آتے؟ میرا دل خوشی سے بھر سا گیا۔

"رسول بابا ——— ادھر آؤ ———" انہوں نے سختی سے ہونٹ بھینچ کر انہیں پکارا۔

"جی سرکار ———" وہ ہمیشہ کی طرح محبت کی تصویر بنے لپکے آئے۔

کتنی ہی دیر تک نوکر اور آقا ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے، آخر بابا نے سر جھکا لیا۔

"بابا ——"

انہوں نے زبان کھولی

"شوبی تمہیں اتنا چاہتی ہے کہ میں تمہیں پولیس میں دینا نہیں چاہتا، لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم اپنے منہ سے یہ اقرار کر لو کہ تم نے ہمارے یقین کو ٹھیس پہنچائی ہے۔"

بابا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

"میں اتنا برا نہیں ہوں سرکار ——— بٹیا کے کنگن میں نے نہیں لئے"

انہوں نے زہر خند قہقہہ لگایا۔

"میں نے اپنی زبان سے کنگن کا نام لیا ہی نہیں، تو تم کیسے سمجھ گئے کہ بات کنگن کی ہو رہی ہے؟ اس کا مطلب

صاف سیدھا یہی نکلتا ہے کہ تم نے ہی کنگن چرائے ہیں"۔

بابا کچھ نہ کہہ پائے ـــــ وہ ایسے کانپ رہے تھے جیسے تیز ہوا کے آگے درخت جھول جھول جاتا ہے۔

اک دم وہ ان کے پیروں پہ گر پڑے اور گڑگڑا گڑگڑا کر کہنے لگے۔

"یہ میری زندگی کی پہلی اور آخری چوری ہے سرکار، یقین کیجیے ان ہاتھوں نے کبھی کسی کی ادنیٰ سی چیز کو بھی نہیں چھوا، لیکن آج ...."

آواز آنسوؤں کی شدت سے ٹوٹ کر رہ جاتی تھی۔ مگر وہ گڑگڑائے جا رہے تھے۔

"مجھے جیل کی ہوا نہ کھلایئے سرکار، میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں"۔

"لیکن بابا ـــــ" میں رندھے گلے سے بولی۔ "تمہیں چوری کرنے کی ضرورت کیا آ پڑی تھی، تم مجھ سے مانگ لیتے، کنگن تم نے کیوں اٹھائے؟"

"بٹیا ـــــ!" وہ سسک کر بولے "ماں تا اور محبت کی پکار بری ہوتی ہے، جینے نہیں دیتی"۔

"مگر بابا"

میں حیرت سے بولی

"آج سے پہلے تو تم نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں، میرا کوئی نہیں، مجھے تو پتہ بھی نہیں کہ تمہاری

کوئی اولاد بھی ہے"۔

"ہاں بیٹیا ـــــ نہیں کہا، میری ایک اولاد وطن میں ہے، اسی کی خاطر میں نے یہ ندامت مول لی ہے"

وہ ان کی طرف بڑے دکھ بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"سرکار چاہے جو سلوک کیجئے، میں نے کنگن بیچ کر روپے اپنی اکلوتی اولاد کو بھیج دیئے ہیں ـــــ" اور وہ ان کے پیروں میں گر پڑے۔

وہ غصہ سے پیچھے ہٹ گئے۔

"مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ شوبی کا واسطہ نہ ہوتا تو تمھیں ایک منٹ اس گھر میں نہ ٹکنے دیتا، تم جیسے ذلیل آدمی کی صرف ایک ہی سزا میں سوچ سکتا ہوں"

پھر وہ باری باری ہر نوکر سے، بچوں سے، ریاض سے، مجھ سے مخاطب ہوئے اور بولے۔

"آج سے اس نیچ آدمی کو ہر شخص چور بابا کہہ کر پکارے تاکہ اسے اپنا یہ گناہ ہر لمحہ یاد رہے ـــــ" اور وہ پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

بچے تو بچے ہی ٹھہرے، ویسے چھوٹا تو ابھی بولنا سیکھ رہا تھا۔ لیکن آقا کا حکم نوکر کیسے ٹالتے، کوٹھی میں بسنے والا ہر شخص جو بابا کو پہلے رسول بابا، یا بابا کہہ کر پکارتا تھا، اب چور بابا کہنے لگا، صرف میں ایک ایسی

تھی جو نہ بابا بولتی تھی نہ چھوٹا بابا۔

میں نے ان سے بات کرنی ہی چھوڑ دی۔ وہ بات کرتے تو جواب ضرور دے دیتی۔ لیکن خود کبھی ان سے بات کرنے کو جی نہ اُمڈا۔

وہ بھی تھکے تھکے سے، مرے مرے قدموں سے، جھکے جھکے اب بھی ساری کوٹھی کا کام سنبھالے ہوئے رہتے، لیکن سب کی نگاہوں سے وہ گر چکے تھے، ہم کہیں جاتے تو یہ خاص طور سے بابا کو سنانے کی خاطر اونچی آواز سے بولتے

"الماری اور سیف کو اچھی طرح بند کر لو، چوروں اچکوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے"۔

بابا کچھ نہ بولتے۔ بچوں سے ان کی محبت بدستور قائم رہی، بچے معصوم فرشتے، وہ بھی ان کے گرویدہ رہے۔ دونوں کا اکثر وقت بابا کی کوٹھری میں ہی گذرتا۔

ان سارے دنوں میں حالات کافی بدلے، ریاض کو ایک نوکری کا انٹرویو کال آیا اور وہ دہلی چلا گیا۔ ان پر خدا اور مہربان ہوا۔ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا کامیابی نے قدم چومے مٹی کو بھی ہاتھ لگایا تو سونا ہو گئی۔

بابا اور بوڑھے اور وفادار ہو گئے۔

ہمارے گھر ایک اور ننھے سے گڈے نے جنم لیا۔ زندگی مکمل ترین اور خوب سے خوب صورت ترین بن گئی۔ لوگ کہتے ہیں اللہ نے دنیا میں کوئی چیز مکمل نہیں بنائی

ہر چیز میں کوئی نہ کوئی کمی رکھی ہے۔ میں سوچا کرتی میری زندگی میں کیا کمی ہے؟

اور آج اتنے سال گذرنے پر میں سوچ رہی ہوں میری زندگی میں کوئی تو کھٹک ہے، احساس گناہ کا ناگ رہ رہ کر دل کو ڈسے لیتا ہے میں کیا کروں؟ اس گناہ کے داغ کو کیسے دھوؤں؟"

میں خط ہاتھ میں تھامے، دھیمے دھیمے قدموں سے چلتی ان کے کمرے تک آئی ہوں، خط میں نے ان کے ہاتھوں میں تھما دیا ہے اور خود نڈھال ہو کر صوفے میں گر گئی ہوں انہوں نے خط پڑھ کر سامنے ٹیبل پر ڈال دیا ہے، دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہ بہت نادم اور دکھی نظر آرہے ہیں۔

ہم دونوں کی نگاہیں ایک بار ملتی ہیں۔ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر کہہ نہیں پاتی،

نیلا کاغذ ہوا سے پھڑپھڑا رہا ہے اور سارے الفاظ جیسے مجھے رہ رہ کے رونے پر اکسا رہے ہیں۔ اس سیدھے سادے خط میں لکھا ہے۔

میری اچھی بھابی!

کئی سال بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں، میں آپ کو بھولا نہیں تھا۔ آپ سی شفیق بھابی کو میں بھول بھی کیسے سکتا ہوں، آپ کی محبت ہمیشہ میرے دل اور زندگی پر چھائی رہی، بھیّا کے مقابلے آپ مجھے کتنا چاہتی تھیں، ایسی بھابی کو کوئی بھلانا بھی چاہے تو نہیں بھول سکتا۔

بھابی اتنے برسوں بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں تو سوجھتا نہیں کہ کہاں سے ابتدا کروں اور کہاں پہ انتہا، پر آج آپ کے سامنے دل کا بوجھ بھی اتارنا ہے، بھابی، مجھے آپ سے کہتے ہوئے عجیب سی ندامت ہو رہی ہے، جھجک آ رہی ہے، لیکن سوچتا ہوں آپ سے بھی نہ کہوں گا تو کس سے کہوں گا اور دل کا بوجھ کیسے ٹلے گا

بھابی، آپ کو بتادوں مجھے دہلی سے انٹرویو کال وغیرہ کچھ بھی نہیں آیا تھا، میں یونہی بہانے سے گھر سے نکل پڑا، دہلی ضرور آیا مگر اس طرح کہ آپ کے کنگن چرا کے بیچے، روپیہ نقد کیا، دہلی آکر پاسپورٹ کے لیے کوشش کی اور بڑی مصیبتوں کے بعد کنیڈا پہنچ گیا، کرائے کے لیے رقم کا بندوبست میں صرف اسی طرح کر سکتا تھا بھابی کہ چوری کر دی، نئے ملازم رسول بابا کی آمد نے میری اسکیم میں رنگ بھر دیا ظاہر ہے ان کے سوا کسی پر آپ لوگوں کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔

کنگن چرانے کے بعد اگر میں بھاگ جاتا تو مشکوک ہو جاتا

اس لئے میں نے کنگن بیچ کر روپیہ اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اور کافی دن بعد وہاں سے دہلی کے لئے روانہ ہوا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔

اس سلسلے میں میں رسول بابا سے جتنا شرمندہ اور جتنا ممنون ہوں اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ لیکن، بھابی دنیا میں زندہ رہنے اور کامیاب بننے کے لئے مجھ جیسے لوگ سوائے بے ایمانی کے اور کر بھی کیا سکتے ہیں ——

آج یہاں آئے مجھے پانچ چھ سال ہو گئے ہیں۔ میں نے بے پناہ ڈالر کمائے ہیں ایک خوب صورت گھر خرید لیا ہے، دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو میرے پاس نہ ہو۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ میں نے بابا کو جو زندگی دی ہے وہ زہر میرے وجود سے نہیں جا سکتا۔ پتہ نہیں بابا آپ کے پاس ہیں یا نہیں، لیکن اگر ہوں تو نہیں میں ان سے معافی تک مانگنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا۔

اس کہانی کا کلائمکس یہ ہے بھابی کہ اپنی نام نہاد دہلی کی روانگی کے وقت جب میں سب سے مل ملا کر بابا سے ملنے گیا اور ان سے کہا کہ بابا مجھے معاف کر دو میں نے تمہیں ایک بڑی ذلت بھری زندگی بخشی ہے، میں نے کنگن چرا کر الزام تمہارے سر لگوایا ہے، تو بھابی پتہ ہے اس فرشتے نے کیا جواب دیا تھا؟ انہوں نے کہا تھا۔

”بیٹا جب تم کنگن اٹھا کر گھبرائے بھاگ رہے تھے

تو میں نے دیکھ لیا تھا، لیکن تم اپنی زندگی شروع کرنے جا رہے تھے، میں اپنی زندگی ختم کر چکا تھا، ایک بنتی ہوئی زندگی کو میں کیسے بگاڑ دیتا،،

گو یا وہ شروع سے ہی میرے راز کے شریک تھے، مگر ان کی عظمت اور شرافت دیکھیے کہ یہ کلنک ہنسی خوشی اپنے ماتھے پر لگا لیا۔

بھابی مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے، پیسہ ان تمام کلفتوں کا بدل نہیں ہو سکتا، لیکن پھر بھی اگر بابا ابھی تک آپ کے پاس ہوں تو ان روپوں میں سے پانچ ہزار روپے آپ بابا کو میری طرف سے ضرور دے دیجئے اور ان سے کہہ دیجیے، ان کے نابکار بیٹے نے انہیں یہ حقیر نذرانہ بھجوایا ہے۔ اب کیا کہوں بھابی سمجھ میں نہیں آتا ــــــ!"

آپ کا ــــــ ریاض

ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے خط کانپ رہا ہے، میں چاہتی ہوں بابا کو بلا کر معافی مانگوں، لیکن میری آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز حلق ہی میں گھٹتی جا رہی ہے، میں رونا چاہتی ہوں لیکن آنسو جیسے خشک ہو کر رہ گئے ہیں۔

میں سوچ رہی ہوں، بابا کو پکار بھی لوں تو ان سے کیا کہوں گی ــــ؟

روزی کا سوال

"اری او خصم کی رنڈی ___ وہ میرے پاس آ رہا تھا ___" بھرے بھرے بدن والی بولی

"اری چل ری چل بھاڑ کھاؤنی ___ وہ میرے پاس آ رہا تھا ___"

"ہاں ہاں وہ تیرا باپ تھا نا اس واسطے تیرے کو گود میں سلانے آ رہا تھا ___"

"اور نہیں تو وہ تیرا بچہ تھا نا تیری مانڈی پر لیٹ کر تیرا دودھ پینے آ رہا تھا ___"

ذرا ٹھہر تو چھنال گھوڑی تیرا منہ پیٹ نوچ ڈالی تو میرے کو بولنا پھر ___"

اور ان شاندار ڈائیلاگس کے ساتھ وہ وہ چھینا جھپٹی ہوئی کہ اشرف کے ہوش ٹھکانے آ گئے ___ ایک

سے بال دوسری کے ہاتھ میں تھے تو دوسری کے بلاؤز کے چیتھڑے پہلی والی کے ہاتھ میں جھول رہے تھے ــــ

پہلی والی ہانپ کر بولی ــــ "ٹھہر ذرا اسی سے پوچھ لے کہ وہ کس کے کنے آ رہا تھا ــــ"

دوسری لپک کر اشرف کے پاس آئی اور اس کا کالر پکڑ کر بولی ــــ

"بولو صاحب تم کس کے پاس جانے والے تھے ــ؟ میرے نا ــــ؟ یا اس کٹنی دو ٹکے کی چھنال کے ــــ؟"

اس کے انداز اس قدر جارحانہ تھے کہ اشرف جو آگے ہی باؤلا سا ہو رہا تھا بالکل ہی ــــ سٹ پٹا گیا ــــ

"جی ــــ جی ــــ وہ ــــ میں ــــ"

"ارے جی، جی، میں میں کیا لگا رہے ہے جی ــــ بکری کے بچے کے جیسی ــــ میرا نام شالو ہے ــــ وہ حرام کی جنی، کتیا کی اولاد چھنی ہے ــــ بولو شالو کے واسطے آئے تھے یا چھنی کے ــــ؟"

اشرف نے واقعیٔ بکری کے میمنے کی طرح معصوم لگا ہوں سے دونوں کی طرف باری باری دیکھا، زبان ساتھ چھوڑ گئی ــــ

"ابے بولتا ہے کہ دیوں ایک رپاٹا ــــ"

شالو نے اشرف کو ایک طرف اتنی آسانی سے جھلا دیا کہ لمبا چوڑا مرد ہوتے بھی وہ مارے ڈر کے دبک سا

گیا ــــ یقیناً اس کے اندازے کے مطابق شالو ہی زیادہ، طاقتور اور قابض قسم کی تھی۔ اس لئے اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ دھیرے سے شالو کا نام لے دے۔

"جی میں دراصل آیا تو آپ ہی سے ملنے کے لئے تھا"۔

"ملنے کے لئے ــــ؟" شالو ایک حقارت آمیز قہقہہ لگا کر بولی ــــ "ملنے کے لئے ــــ؟ ارے صاحب ملنے کے لئے تو ماں بہنوں سے جاتے ہیں ــــ ہم کیا تم کو اپنی ماں بہن لگتے ہیں ــــ؟"

"جی ــــ جی ــــ دراصل میں ایک تجرباتی فلم لکھنا چاہتا تھا ــــ"۔

"پھلم ــــ؟ شالو نے بہت کچھ سمجھ لینے کے انداز میں سر ہلایا ــــ "مطلب تم ایسٹرا بھرتی کروانے کو آئے ہو یُوں گے ــــ نا ــــ"۔

"ایسٹرا ــــ؟" اشرف گڑبڑا کر بولا ــــ پھر اک دم اس کے دماغ میں ایک بلب سا جلا۔ ایکسٹرا ــــ وہ پہلی بار ذرا سا مسکرایا۔

"جی نہیں ــــ آپ غلط سمجھیں۔ میں ایکسٹرا بھرتی کروانے نہیں آیا ــــ میں تو دراصل ایک کہانی لکھنے والا ہوں ــــ اور کہانی کی تلاش میں یہاں آیا تھا ــــ"۔

شالو ذرا مایوسی سے بڑے ذلیل کرنے والے انداز سے بولی ــــ "تو یوں کہو نا صاحب کہ تمہاری گاڑی میں

پٹرول نہیں ہے ــــــــ"

اشرف نے سر موڑ کر باہر گلی کی طرف دیکھا جہاں یقیناً اس کی گاڑی نہیں کھڑی تھی اس لئے کہ ابھی تک تو وہ اتنا خوش نصیب نہیں تھا کہ گاڑی خرید پاتا ــــــــ وہ بولا.

" دیکھئے شالو بی بی میرے پاس گاڑی تو ہے ہی نہیں اس لئے پٹرول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ــــــــ"

شالو چلا کر بولی.

" ابے الّو صاحب ــــــــ گاڑی میں پٹرول کا مطلب نئیں معلوم ــــــــ ارے جو مرد ڈھیلا رہتا نا، اس کے واسطے ہماری بول چال میں ہم ایسا ہی بولتے کہ گاڑی میں پٹرول نئیں تو آیا کیا کرنے ــــــــ سمجھے کہ نئیں او کہانیاں لکھنے والے صاحب"

اشرف کا پورا جسم پسینے میں بھیگ گیا.

اگر کوئی برابری کا مرد یہ طعنہ دیتا تو وہ ایسا کرارا ہاتھ دیتا کہ چودہ طبق روشن ہو جاتے مگر اس چھوکری کے وہ کیا منہ لگتا ــــــــ

چنّی موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھا کر دور جا کھڑی ہوئی اور شالو کو انگوٹھا دکھا کر بولی.

" لے ٹھینگا ــــــــ اب اتراتی رہ کہ وہ میرے واسطے آیا تھا ــــــــ ایسے پھوٹے ڈھول کو تو ہی سنبھال ــــ میں تو چلی ــــــــ"

" چلی کہاں کتّے کی جنی ــــــــ میرے گراہک کو پھوٹا

ڈھول بولتی ـــــ "

" پھر کیا ــــ؟ " چنی کا حوصلہ اس وقت بڑھا ہوا تھا ــــ وہ ہاتھ نچا کر بولی ـــ

" سو بار بولوں گی چھوٹا ڈھول، چھوٹا ڈھول چھوٹا ڈھول ـــــ اب بول کیا کرتی ہے میرا ـــ "

" چھوٹا ڈھول دکھ رہا تھا وہ تو تو نے اس کو دیکھ کر اشارہ کیوں کری تھی ـــــ؟ "

" اشارہ میں نے کری تھی ؟ اری چھنال تو نے ہی ساڑی کا پلّو سینے پر سے گرائی تھی ـــــ "

" سینے پر سے پلّو میں نے گرائی تھی ؟ اری جل ککڑی میرا سینہ ہی لوڈا اتنا تنا ہوا ہے کہ پلّو گر گر جاتا۔ تیرے جیسا سپاٹ، مرغی کا کھڑارہ میرا سینہ نہیں ہے سمجھی ـــ "

" ہاں ہاں سب معلوم ہے، تیرے جیسا ربر کے کپ اونر ہے کر کر کے میں نئی رکھتی ـــ "

کیا بولی ڈکرہ کی بچی، میں ربر رکھتی چولی میں گھسیٹر کے ـــــ لے دیکھ ادھر دیکھ ـــــ "

اور اس نے جھر رکر کے اپنا بلاؤز پھاڑ کے رکھ دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اشرف کی نگاہیں اٹھ گئیں اور اسے ایسا لگا جیسے اس کی ٹنکی پٹرول سے فل ہوا اور فی گھنٹہ ڈیڑھ سو میل کی رفتار سے اس کی گاڑی اڑی چلی، جا رہی ہو ـــــ

کانوں میں سائیں سائیں کرتے انجن کو اس نے بڑی مشکل سے روکا اور منہ پھیر کر بولا ـــــ

" شالو بی بی آپ خواہ مخواہ جھگڑے کھڑے کرتی ہیں۔"

باریک ساڑی کا پلّو ایک تنا کے سے اپنے کھلے سینے پر ڈال کر وہ اشرف کے عین چہرے کے پاس آ کر چلائی،

" بی بی ـــ بی بی ـــ بی بی ـــ! بی بی ہوئی تیری ماں تیری بہن، تیری ہونی سوتی۔ میرے کو ایسے گالیاں مت دے۔ بڑا آیا کہانیاں لکھنے والا ـــ چل نکل یہاں سے کہانیاں قلم سے کاغذ پر لکھے جاتے ـــ یہاں ہمارے جسموں پر مردوں کے انگلیاں چلتے ـــ ایسی کوئی کہانی لکھنے کا ہے تو لکھ ـــ نئیں تو اپنا راستہ ناپ ـــ وہ ادھر ہیں سیڑھیاں ـــ جدھر سے چڑھا تھا ـــ"،

" میں بھی سالا کدھر آ کر پھنس گیا ـــ"، اشرف نے خود کو سنایا۔ " ریڈ لائیٹ ایریا " پر کہانی لکھنے کا آئیڈیا پتہ نہیں کس منحوس گھڑی سے آیا تھا کہ لاکھ کی عزت خاک ہوئی جا رہی تھی ـــ نہ اب تک کوئی پلاٹ ہاتھ لگا تھا نہ کوئی خاص معلومات ہی مل سکی تھیں۔ لے دے کے چند گالیاں ضرور نئی نئی معلوم ہو گئی تھیں ـــ لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس جنجال سے نکلے تو کیسے ـــ دونوں شیرنیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے تنی کھڑی تھیں ـــ

پرے کمرے سے آواز آئی ـــــ بے حد کراری!

"ارے چنی ـــــ وہ تیرا گاہک پیچھے بازو سے کب سے آکر بیٹھا ہے، دودھ والا بھیّا۔ کیا کر رہی ہے وہاں ـــ"

شالو حقارت سے چنی کی طرف دیکھ کر بولی۔

"اری او بھینس جا اپنا دودھ دوہا لے، آگیا تیرا بھیّا۔"

چنی کچھ فخر سے بولی ـــــ "اب بول نا کہ وہ بھی تیرا ہی گراہک ہے ـــــ"

اب کی بار خلافِ توقع شالو بے حد جھنجھلاہٹ سے بولی۔

"وہ تو تیرا بندھا ہوا گراہک ہے، میرے کو معلوم نئیں کیا ـــــ مگر جب کوئی نوا گراہک کے واسطے آتا اور جھپٹ لیتی تو پھر میں کیوں تیری بوٹیاں نئیں نوچوں؟"

اتنے میں وہ کراری آواز والی محترمہ کمرے میں تشریف لا چکی تھیں ـــــ منہ بھر کے پان ـــ دانت سیتا پھل کے بیجوں کی طرح سیاہ ـــــ سر میں بیحد چپڑ چپڑ تیل، کان میں ادھ جلی سگرٹ اٹکا ہوا ـــــ بے حد گہرے رنگ کی لال لپ اسٹک جو ان کے سیاہ چہرے پر سخت کنٹراسٹ پیدا کر رہی تھی ـــــ بڑے بڑے چھاپے والی ساڑی ـــ میل بھرے زیوروں سے لدی ـــ

"صاحب بائی جی کو سلام کر دے ـــ"، چنی نے اشرف

کو تہذیب سکھائی ـــــــ

ابھی اشرف سلام کر بھی نہیں پایا تھا کہ شالو ایک نظر اشرف اور ایک نظر جینی کو ذرا حقارت سے دیکھ کر بولی ـــــ

"ان لوگ کو کہاں اِتی انگریجی آئے، کِتی بار سمجھائی کہ ممی بولا کر ـــــ"

اشرف نے بوکھلا کر شالو کو دیکھا جو بے حد لا پروا سے کہہ رہی تھی ـــــ

اِدھر پوری چال میں بس میرے کو انگریجی آتی ہے صاحب ـــــ معلوم ہے کیوں ـــــ؟ ایک بار میں پھلم میں کام کرنے کے واسطے گئی تھی اس واسطے ـــــ"

"اچھا ـــــ؟" اشرف کو دل ہی دل میں ہنسی آئی، لیکن وہ یہ ہنسی ہونٹوں پر لا کر اس جھگڑالو ں قیامت سے الجھنا نہیں چاہتا تھا ـــ بولا ـــ

"پھر کیا ہوا ـــ وہ فلم ریلیز ہوئی یا نہیں ـــ آپ کی ـــ"

"نئیں صاحب وہ پھلم میری غلطی سے ریلیج نہیں ہو سکی ـــ"

"وجہ کونی ـــ؟"

"وہ وجہ یہ ہو گئی تھی۔ وہ ہاتھ ہلا کر بتانے لگی کہ پہلے ہی دن ہم چار پانچ چھوکری لوگ کو ایک ایشٹرا سپلائی کرنے

والا ادھر اشٹوڈیو میں لے گیا ـــــ وہ پھلم جو بناتا ہے. اس آدمی کو کیا بولتے صاحب ـ" وہ شائد بھول گئی تھی. اشرف نے یاد دلایا۔

"ڈائرکٹر ـــــ"

لفظ کچھ مشکل تھا شالو کے پلّے نہیں پڑا، ہاتھ کو جھٹک کر بولی.

"ہو ئینگا کوئی بھی ڈکٹر کا سگا. میرے کو کیا ـــــ ہاں تو معاملہ کائے شے پلٹ ہو گیا، معلوم ؟ وہ پھلم بنانے والا میرے کو سکھایا کہ اب تم نے ایک ڈیالوگ بولنا..."

"ڈیالوگ ـــ ؟" اشرف ہڑبڑایا ـــ دوسرے ہی لمحہ وہ سنبھل گیا ـــ اچھا "ڈائیلاگ"

"دیکھو صاحب ـ میں پہلے ہی بول دی کہ ادھر بس ایکلی کو میرے کو انگریجی آتی ہے ـــــ تم بات پوری سنو بیچ بیچ میں لوٹو مت، ایسے سے قصہ سناتے میں بہت ڈسٹرب ہوتا"

"ٹھیک ہے معاف کر دیجئے ـــ میں آگے سے چپ چاپ سنوں گا ـــ"

"تو تم گونگے کی اولاد ہے کیا ـــ منہ میں زبان نئیں کیا جو چپ چاپ سنوں گا ـــ مگا معلوم کس کو بولتے جس کو بات کرنا نئیں آتا ـــ میرے کو ایسے لوگ بھڑ بھسں لگتے کہ میں تو چپڑ چپڑ باتیں سناؤں اور

خود خالی بیٹھ کر سن رہے ــــــ تم بات کرو ضرور، مگر جب جب تمہارے کو کوئی انگریجی بات سمجھ میں نہ آئے ــــــ"

"جی درست فرمایا ــــ" اشرف بظاہر سنجیدہ بن کر بولا ــــــ

"تو وہ پھلمؔ بنانے والا میرے کو یہ بولا کہ اب تم یہ ڈیالوگ بولنا "اگر تو نے میری طرف دیکھا تو میں تیری آنکھ پھوڑ دوں گی" اب وہ جو دِلّن تھا نا ــــ دلّن سمجھتے ہو کہ نئیں تم ــــ

"جی ہاں جی ہاں سمجھتا ہوں وہی جو دلّن ہوتا ہے"

"خاک پڑے تمہاری عقل پر لے کے بول دیا وہی جو دلّن ہوتا ہے ــــ ارے دِلّن وہ جو ہمیشہ پھلمؔ کی چھوکری کی عزت خراب کرتا ــــ"

"جی ہاں میں بالکل سمجھ گیا ــــ آپ بات پوری کیجئے"

"تو وہ جو دلّن تھا نا اس نے میرے کو لال لال آنکھوں سے گھورا تو میں خوب تیزی سے دوڑی ــــ ایسا بولتے ہوئے کہ "اگر تو نے میری طرف دیکھا تو میں تیری آنکھ پھوڑ دوں گی ــــ" مگر شاید میرے آنکھ پھوڑنے میں کچھ کسر رہ گئی ہوئیں گی، کیونکہ کیونکہ اس کا دیدہ برابر سے میرے ہاتھ میں نئیں آیا ــــ بس ذرا سی کمی رہ گئی ــــ سب لوگ بجائے واہ واہ کرنے کے دلّن کی طرف دوڑے

کیونکہ وہ ہائے ہائے کر کے وہیں لمبا لمبا لیٹ گیا تھا۔ اور آنکھ کے آزو بازو سے اور گال پر سے اور گال پر سے کچھ خون بھی نکل رہا تھا۔"

اشرف نے اپنا گال سہلایا ــــ اور دھیرے، دھیرے سر ہلا کر بولا ــــ

"جی ہاں دراصل وہ فلم ڈائرکٹر آپ کے فن کو پرکھ نہ پایا ورنہ فلم ہٹ ہو جاتی ــــ"

"ارے نہیں جی صاحب ــــ پھر میں اس چکر میں پڑی ہی نہیں ــــ معلوم کیوں ــــ؟"

"جی نہیں ــــ" اشرف مسمی صورت بنا کر بولا

وہ اس واسطے کے میرے کو جلدی ہی معلوم پڑ گیا کہ جو دھندہ یہاں شرافت سے کوٹھری میں بیٹھ کر ہوتا وہی سب ایشٹرا لڑکیوں کے ساتھ بے شرمی سے باہر ہوتا ــــ تو تم ہی بتاؤ صابٔ یہ شرافت کا دھندہ یہاں اچھا کہ کھلّے بھی سب کے سامنے ــــ اصل سوال تو روپے کا ہے ــــ وہ تو یہاں بھی ملتا صابٔ ــــ ہے کیا مت؟"

پتہ نہیں بائی جی کب جنّی کو اپنے ساتھ لے کر کوٹھری کے پچھواڑے چلی گئی تھیں کہ اب شالو کی باتوں سے ذرا مہلت پائی تو اشرف نے دیکھا کہ جنّی ساڑی برابر کرتی، بلاؤز کے ہک لگاتی پھر سے کوٹھری میں وارد

ہو چلی تھی۔ کچھ فاتحانہ انداز سے وہ شالو سے بولی۔

"تو تو یونہی ٹہل ٹکوری میں لگی رہی دیکھ میں نے تو ایک گراہک بھی نمٹا دی ——"

"کتّا دے کر گیا ——" شالو بڑی خوشی سے بولی۔

"وہ تو روز کا بندھا ہوا ہے —— تین روپے۔"

شالو کے چہرے پر دکھ کا ایک رنگ سا آکر گذر گیا۔

جسے اشرف نے بڑی حیرت سے دیکھا ——

"ایک بار ——؟" وہ اپنے مخصوص چھپے ڈھکے لہجہ میں کچھ پوچھنے لگی جو اشرف کے پلّے نہ پڑا ——

"پھر اور کتی بار —— اصل میں دیوالی عید دو نوں قریب ہے نا۔ دیکھ بھیڑ کتّی ہے۔ جلدی جلدی گاہک آتے ہیں تو نپٹانا بھی تو جلدی ہی پڑتا ہے نا ——"

دونوں ہنسنے لگیں —— اشرف کی سمجھ میں ان کی لڑائی آئی تھی نہ یہ ہنسی۔

اس نے بیچ میں کئی بار اٹھنا چاہا لیکن بہت نہیں کیوں اس کی فنکارانہ حس کہہ رہی تھی کہ آگے وہ کچھ دیر اور بیٹھا تو ضرور کچھ نہ کچھ مال مسالہ تو لے کر ہی اٹھے گا، اسی لئے وہ کراہیت سی محسوس کرنے کے باوجود ایسے کثیف ماحول میں اپنے آپ کو بٹھائے جا رہا تھا ——

قید خانے کی سی سلاخوں والی کوٹھری کے اندر سے اچانک شالو اور رجنی کی نظریں باہر جا پڑیں —— جہاں

ایک شرمائی شرمائی صورت والا نوجوان کچھ کر گذرنے کی ہمت، اور ہمت نہ پا سکنے کی جھجک کے مابین کھڑا اندر جھانکے جا رہا تھا ——

اک دم شالو چلائی ——

"اے دیکھ تو نے حرامی پن کری تو —— دیکھ وہ میرے کو ہی دیکھ رہا ہے ——" اور اس نے اپنے پھٹے ہوئے بلاؤز پر سے دانستہ ساڑی ہٹا دی ——

"بھئی یہ حرکت آپ بار بار نہ کریں ——" اشرف گڑ بڑا کر بولا ——

اس کی بات کو سنی ان سنی کر کے شالو جینی سے بولی.

"دیکھ بول دی میں نے —— یہ گراہک میرا ہے وہ سیدھا میرے کو ہی دیکھ رہا ہے ——"

"اری چل ری —— تیرے میں کیا دم ہے، بس زبان ہی چلتی ہے تیری تو —— اور گراہک کو پھانسنے کے واسطے کچھ اور بھی چلانا پڑتا ——"

"حرام کی جنی —— ایک ایک رات میں بارہ بارہ کو، بھگتا کے بیٹھی ہوں، میرے کو سمجھتی کیا ہے ——"

"اور بجے نیئں تو اپنے آپ کو کیا سمجھتی، میرے کو تو، کھیچی کے دیسی کمر دکھتی تیری"

"اری چھنال —— کھیچی کے دیسی کمر پہ تو مرد کی جان جاتی —— تیرے جیسی زہر کی پٹاری نہیں ہوں میں کہ مرد

بازو سے اٹھے تو آنگ دھونے کو سیدھا موری میں بھاگے،
ابھی چنی کچھ جواب نہ دے پائی تھی کہ پھر بائی جی وارد ہو گئیں ــــ ان کے ایک ہاتھ میں بھیل پوڑی کی ایک میلی سی رکابی تھی جس میں سے وہ پھنکے لگاتی جا رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں وہ اپنی کتھے چونے سے لتھڑی انگلی سے ہری مرچوں کی میٹھی بھی چاٹتی جا رہی تھیں ــــ
"دیکھ شالو ــــ انہوں نے اسے غیرت دلائی۔
"چنی نے میرے کو آٹھ آنے بھیل پوری کے واسطے، کمیشن سے ہٹ کر دی ــــ تو تو کمینی ہے کنجوسڑی ــــ کچھ نہیں دیتی ــــ"
شالو نے صرف غصہ سے دیکھا کہا کچھ نہیں۔
"اور ہولی پر ساڑی بھی دی تھی ــــ اور عید پر کان کے بھی......
شالو پھر سے باہر سے جھانکتے اس شرمیلے مرد کو گھیرنے کی کوشش میں لگ گئی تھی، بائی جی نے اشرف کو ذرا غور سے اور زیادہ غصہ سے دیکھا اور غصہ کے اظہار کے طور پر ذرا زیادہ چٹنی کھا کر بولیں ــــ
"اب کیا ہے ــــ؟
"اب ــــ؟ جی ــــ جی ــــ" وہ بوکھلا کر بولا جی ــــ جب بھی کچھ نہیں تھا ــــ"
"وہ تو میرے کو معلوم ہے جی کہ جب بھی کچھ نہیں

تھا اسی لئے تو پوچھ رہی ہوں، کہ اب کیا ہے ــــ"

اچانک اشرف کو احساس ہوا کہ اس نے واقعی اب تک سخت حماقت کا مظاہرہ کیا ہے، ڈھلتی شام کے اس بزنس کے سمے میں وہ ان لڑکیوں کا سخت مالی نقصان کر رہا تھا۔ اگر وہ کسی غلط ارادے سے نہیں بھی آیا تھا تو کم از کم اُسے اتنا تو کہہ دینا ہی چاہیئے تھا کہ وہ کچھ کرے نہ کرے بہر حال پیسے ضرور دے گا تاکہ ان لڑکیوں اور بائی جی کو کوئی اعتراض اور مالی تکلیف نہ ہو ــــ

وہ سخت کشمکش کا شکار تھا کہ اس قسم کی گندی سودے بازی کے لئے کون سے الفاظ استعمال کرے، بہر حال ہمت کر کے بولا ــــ

"جی آپ کو روپیہ بھی توقع سے زیادہ ہی دے جاؤں گا ــــ"

بائی جی زہر خند ہنسی کے ساتھ بولیں

"کیا خالی باتوں کے پچاس روپے دے جائیں گے ــــ یہاں تو "بیٹھنے والے" بھی ۲۵ نہیں دیتے ــــ"

وہ بڑی تکلیف سے بولا ــــ "جی میں ایک دو گھنٹے اور بیٹھوں گا۔ اور سَو روپے دے کر جاؤں گا ــــ"

ایک دم ایک طرف سے شالو، دوسری طرف سے جینی اس سے آکر لپٹ گئیں ــــ

"صاحب مگر تم یہ روپے کس کو دیں گے؟"

"صاحب ___ یہ روپے تم میرے کو دیں گے نا ___؟"

"صاحب پہلے سچی بولو تم نے میرے کو دیکھ کے مسکرائے تھے نا ___؟"

"صاحب تم شرما کے بات مت ٹالو تم نے پہلے سچی بولنا میرے کو آنکھ مارے تھے نا ___؟"

سَو روپے کی نوید سن کر بائی جی کے الگ دیدے پھٹ گئے تھے ___ وہ تو اچھا ہوا بھیں پوری پہلے ہی وہ چٹ کر چکی تھیں البتہ میلی تام چینی کی رکابی ایک، چھنا کے سے گری اور یہاں وہاں باریک تام چینی کے ریزے پھیل گئے ___ ٹین کی رکابی دیر تک، کھڑ کھڑ کھڑ کھڑ گول گول گھومتی اور بجتی رہی ___

اشرف کا اپنا دماغ بھی گول گول گھوم رہا تھا ___

"کس الو کے پٹھے نے تمہیں یہ مشورہ دیا تھا بیٹے کہ طوائفوں پر فلمی کہانی لکھو اور نام کماؤ ___"

دونوں کی کھینچا تانی اختتام پر یوں آئی کہ چالاک شالو نے چنی کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ باہر کھڑا ہوا وہ شرمیلا نوجوان مجھے ہی اشارہ کر رہا تھا ___ شالو یقیناً زیادہ چتری تھی، کیونکہ چنی پردے کے پیچھے اپنا سنگھار تازہ کرنے چلی گئی تو وہ اشرف کے کندھے پر جھک کر بولی ___

"وہ چھنال رنڈی اب دنداں ہو گئی۔ اب تم صاحب

جو چاہو کر لیو مگر وہ سو روپے میرے کو دے دیو ــــ "
اشرف نے احمقوں کی طرح پوچھا۔
" چمنی کہاں چلی گئی ــــ "
" ارے وہ جب سے جو جھانک رہا تھا نا جس پر ہم دونوں لڑ رہے تھے ــــ وہ اس کو لے کر پچھواڑے چلی گئی ــــ "
" تو آپ نے اسے کیوں جانے دیا ــــ "
" ارے صائب ــــ " وہ اس سے ذرا دور ہٹ کر اسے غور سے دیکھتی ہوئی بولی ــــ " تمہارے اس کھوپڑے میں کچھ عقل ہے کہ نئیں ــــ وہ بھاڑ کھاؤ اسے کیا دینگا ــــ زیادہ میں زیادہ پانچ روپے ــــ بہوت ہوئے دس روپے ، اسی واسطے تو میں نے چمنی کو بول دی کہ وہ آدمی بچی تیرے کو ہی تانک رہا تھا۔ اب دیکھو وہ ادھر چلی گئی تو تم میرے کو مل گئے۔ مطلب پورے پچاس روپے میرے ــــ "
" پچاس ــــ " اشرف حیرت سے بولا " لیکن میں تو آپ کا وقت خراب کرنے کا پورا سو روپے دوں گا "
ہاں صائب ، تم تو سو ہی دیں گے ۔ مگر وہ کھوسٹ چھنال ممتی چالیس روپے لے لینگی ۔ وہ موا بھڑوا دس روپے ــــ پچاس میرے کو بچ جائیں گے ــــ "
" یہ ممتی اور ...... " وہ کچھ رک کر بولا " بھڑوے

کا کیا قصہ ہے مگر ـــــ"

"اوہنہ ـــــ وہ بے حد حقارت سے بولی ـــــ "صائب تم بھی لبروٹن کے جاہل ہو۔ ارے یہ بائی جی ہے نا ـــــ یہ ہم جیسی دس بارہ چھوکریاں رکھتی، اس کا اپنا ایک آدمی رہتا، وہ بڑھی بائی جی کہلاتی، وہ ساتھ والا جو گھیر گھار کر تم جیسے شریف کمین مردوں کو لاتا بھڑوا کہلاتا۔ آدھی ہماری کمائی تو یہی دو کھا جاتے ـــــ"

اشرف رک رک کر، کچھ حیرت سے بولا ـــــ

"تو آپ لوگ ان صاحب کو بھڑوا ہی کہہ کر پکارتی ہیں ـــــ"

وہ بڑی لاپروائی سے بولی ـــــ جس کا جو جی چاہے کہہ لے، ہم نے اپنی آسانی اور سہولت کے واسطے نام رکھ لیئے ہیں ـــــ اب جیسے سامنے منہ پر منہ پڑتا تو اس کھوسٹ رانڈ کو ممی بولنا پڑتا ـــــ بیٹھ پیچھے ہم چھوکریاں اس کو "چنڈالنی" بولتے ـــــ وہ بھڑوا جو ہے اسکو "کھوٹیا" ـــــ بولتے۔ ـــــ گرہک جب ہم خود پھانستے تو کبوتر پکڑنا بولتے ـــــ بھڑوا گھیر گھار کر لاتا تو مرغا پھنسا بولتے ـــــ رات گذارنے کو "بیٹھنا" بھی بولتے اور اپنے بالکل ہی آپس کی بات ہو تو بولتے "کتنوں کو رات بھر میں مہندی لگا کے چھوڑی ـــــ..."

اشرف گھڑوں پسینے میں نہا رہا تھا مگر شالو ـــــ

بے تکان سنائے جا رہی تھی ــــ

" یہ سب ہمارے راز کے باتاں ہیں۔ سب کو تھوڑی بولتے صاحب !

تم بولے نا صاحب کہ تم کہانیاں لکھتے تو اسی لئے بتا دی صاحب کہ شاید اپنے نصیبوں کی کہانی تم کبھی لکھ دیو صاحب۔ یہ انڈیا میں بہت پورٹی ہے ــــ انڈیا اپنے ہندوستان کو بولتے ــــ پورٹی بولے تو غریبی بس، پورے آزو بازو میں ایک میرے کو ہی انگریجی آتی صاحب باقی تو سب جاہل ہیں رانڈاں۔ بس گھر بک آیا کہ بستر کے ویسا پھر گیاں ــــ میں اخبار بھی پڑھتی ہوں صاحب مگر اخبار اپنے پیسے سے نہیں پڑھتی۔ جوڑوں کے پیسے سے پڑھتی ہوں ...."

جوڑوں کے ــــ ؟"

اشرف ہڑبڑا کر بولا ــــ

" ہاں صاحب ــــ جوڑوں کے ــــ صاحب، یہ ہماری بھاڑ کھاؤ نی می ہے نا، یہ نشے میں دھت رہتی کسی سے پاؤں دبواتی کسی سے جوداں دکھواتی، پاؤں دبوانے والی کو ایک گھنٹہ کا پچاس پیسہ دیتی، اور جواں نکالنے کا ایک جوں کا پانچ پیسہ ــــ

تو صاحب میں ساڑی کے پلو میں کالا زیرہ باندھ کے رکھ لیتی ــــ صاحب کالا زیرہ تم سمجھتے نا ــــ دال

سالن میں پڑتا دہ ــ

بس اس چھنال کے سر میں بیس پچیس کالے زیرہ کے دانے چھوڑ دیتی ہیں، اور ڈھونڈھ کر نکال نکال کر اس کی ہتھیلی میں رکھتی جاتی ــ

اس کو آنکھاں سے ذرا کم دکھتا صاحب۔ بس وہ ہتھیلی پر کالی چیز دیکھ کر سمجھتی کہ جوں ہے اور ہر جوں کے ۵، ۵ پیسے دیتی جاتی.....

اب کے اشرف نے ذرا غصہ سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

" مگر آپ ایک بات بتانے کی کوشش کریں گی کہ آخر آپ لوگوں کو پیسے کی اتنی لالچ کیوں ہے ؟ جب سے آیا ہوں دیکھ رہا ہوں ــ پہلے تو آپ نے مجھ غریب ہی کی وجہ سے چھنی سے وہ مارا ماری کی کہ اسے لہولہان کرنا باقی رہ گیا ــ پھر اپنی داستانیں بھی خود ہی سنا رہی ہیں۔ اب میرے سو روپلے دینے کی بات سن کر چھنی کو بھگا دیا۔ یہ سب کیا ہے ؟"

روزی کا سوال ہے صائب ــ "۔ شالو نے بیحد بے نیازی سے جواب دیا۔

" روزی کا سوال تو چھنی کے لئے بھی ہے، اور اُن آٹھ دس غریب لڑکیوں کے لئے بھی، جنہیں میں نہیں دیکھا ــ لیکن جو ابھی پنجروں میں کہیں بند ہوں گی ــ"

اس کے اندر کا فنکار جاگ اٹھا تھا اور وہ سچ مچ شالو پر

غصہ ہونے لگا تھا ____

"صاحب چڑو مت بھئی ____ سب اپنی اپنی کھینچ پر رہتیاں ہیں ____" وہ ہاتھ ہلا کر بولی۔

اشرف نے جل کر پوچھا ____ "اور یہ تو بتلایئے کہ آپ نے اب تک کتنی جمع جتھا جوڑلی ہے؟"

شالو نے ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ کوئی سن تو نہیں رہا۔ پھر اشرف کے کان کے پاس منہ لاکر بولی ____ "ڈیڑھ ہزار ____"

اس کا انداز یوں تھا گویا اشرف کا اتنی بڑی رقم کے بارے میں سن کر ہارٹ فیل ہو جائے گا، لیکن ایسا نہ ہو سکا، بہرحال وہ سب سے بڑا کہانی نویس نہیں تو اتنا حقیر بھی نہ تھا ____ سال کے پندرہ بیس ہزار تو بنا ہی لیتا تھا ____

"اتنا روپیہ ____ یعنی کہ اتنا بہت سارا روپیہ جمع کر کے آپ کریں گی کیا ____؟" وہ نہیں چاہتا تھا کہ ڈیڑھ ہزار کو اتنے حقیر انداز میں بتائے کہ وہ شرمندہ یا غصہ ہو جائے

"اس میں کچھ روپیہ اور جمع کر دوں گی اس کے بعد ایک گھر بناؤں گی ____"

"گھر ____؟" اشرف حیرت سے بولا ____

"ہاں ہاں گھر ____ کبھی گھر نہیں دیکھے صاحب تم نے چار دیواری کا گھر۔ جو بس اپنا ہو ____ شادی وادی تو ہم

جیسوں سے کون کہنے چلا صاحب۔ اس کی آرزو کرتے بھی نہیں ـــــ مگر گھر ضرور ہونا چاہیئے صاحب، کیوں ـــــ کیوں بولے تو کیا ـــــ معلوم ـــــ؟"

اس اندازِ سوال پر اشرف کو وہ سخت معصوم لگی۔ وہ کچھ نہیں بولا ـــــ وہی سنانے لگی۔

"کیوں بولے تو کیا ـــــ معلوم صاحب، اس واسطے کہ طوائف کا بڑھاپا بڑی سخت ہوتا، کوئی نہیں پوچھتا صاحب ـــــ میں کتنے رانڈاں دیکھی سڑک کے کنارے مرتے دیکھی صاحب ـــــ بس اس واسطے دل بولتا کہ ایک اپنا چھوٹا سا گھر ہونا ـــــ اس گھر میں کچھ نہیں، کچھ نہیں تو بھی پھولوں کے پودے ضرور لگاؤں گی صاحب، کیوں بولے تو کیا معلوم صاحب ـــــ اس واسطے کہ اس پنجرے میں رہتے ہیں ٹھنڈی ہوا کے واسطے ترس گئی صاحب ـــــ"

اشرف کچھ نہیں بولا ـــــ کچھ بول ہی نہ سکا۔ اس کی جیبوں میں سب کل ملا کر دو سو سولہ روپے نکلے، وہ اس نے سب کے سب شالو کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور بھیگی ہوئی آنکھیں لئے اس پنجرے سے باہر نکل آیا۔

تین برس بعد جب اشرف کی پہلی فلم ہٹ ہوئی جو اس

نے طوائفوں کے ٹاپک پر لکھی تھی، تو اس پر شہرت اور دولت کے دروازے کھل گئے ــــ اسے سب سے پہلے شالو یاد آئی ــــ

اس کی لمبی سی گاڑی جب اس بدبودار تنگ گلی کے سامنے جا کر رکی تو پنجرے نما کوٹھریوں سے سستے کریم پاؤڈر اور گہری گہری لپ اسٹک سے سجے کتنے ہی باسی چہرے، جھانکنے لگے ــــ وہ سب کو نظر انداز کرتا ہوا شالو کی کوٹھری میں چڑھ گیا ــــ

بائی جی کان میں ٹوٹی بیڑی دبائے، میلی رکابی میں بھیل پوری کے پھنکے لگا رہی تھیں ــــ گاڑی کو اپنے گھر کے سامنے رکتا دیکھ کر وہ ذرا ناقابلِ یقین انداز میں لڑکھڑائی تو تھیں لیکن یہ سوچ کر کہ وہ کہاں اور ایسی گاڑی کہاں، پھر بھیل پوری میں جت گئی تھیں، لیکن اب اتنے پورے اونچے مردِ کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ پوری کی پوری بوکھلا گئیں۔ اور جو اٹھی ہیں تو رکابی مع بھیل پوری کے ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری۔ اور کھڑ کھڑ کھڑ کھڑ کی آواز کے ساتھ گول گول گھومنے لگی۔

اس شان اور رعب داب کی وجہ سے وہ اسے پہچان نہ پائیں۔ سب نئے چہرے تھے ــــ وہ رک رک کر بولا

"وہ ــــ وہ شالو بی بی کہاں ہیں ــــ؟"

دو چار لڑکیاں کھسر پھسر کر کے ہنسنے لگیں۔

بائی جی کراری آواز سے بولیں ـــــ کراری آواز جو لجاجت سے اور خوشامد سے بوجھل تھی۔

"اُن پرانی باسی چھوکری کو کیا پوچھنا سرکار ـــــ اِدھر دیکھو......"

وہ سٹ پٹا کر بولا ـــــ "جی مجھے اُن سے کچھ بات کرنی تھی ـــــ وہ شالو بائی اور ان کی ایک ساتھی چینی"....

"ارے وہ چینی ـــــ؟" بڑھیا نے نفرت سے کہا "سٹر گئی رانڈ وہ تو ـــــ"

"جی ـــــ" اشرف کا دل دکھ گیا۔

بڑھیا لاپرواہی سے بولی ـــــ ہاں، کوئی روگ لگ گیا تھا ـــــ پورا انگ دانوں پھنسیوں سے بھر گیا تھا ـــــ کوئی منہ میں پانی ڈالنے کو بھی خالی نہ تھا ـــــ وہی پاگل رانڈ شالو اس کو لے کر گئی ہسپتال میں داخل کروائی، پوری جمع جتھا اس پہ لٹا دی اپنی، اس گدھے کی اولاد نے ـــــ"

"جی ـــ؟" اشرف کو یقین نہ آیا ـــــ "مگر مجھے تو ایسا یاد پڑتا ہے کہ ان کی اور چینی کی بڑی سخت لڑائی رہتی تھی ـــــ" وہ بڑی مشکل سے بولا ـــــ

"لڑائی تو ایسی رہتی تھی کہ مرغیوں کی بلّیوں کی چڑیلوں کی لڑائی کیا ہوسکی جیسی وہ شالو حرام کی جنی اس سے لڑتی تھی ـــــ مگر وہ چینی بیمار پڑی تو وہ بولی میں اس کا علاج

نہیں کرواؤں گی تو کون کروائیں گا ـــــ یہ تو اس کی روزی کا سوال ہے ـــــ صحت مند رہینگی تو ہی کوئی اس کے پاس پھٹکے گا۔ نہیں تو وہ اپنا پیٹ کیسے پالیں گی ـــــ ایسا بول کے ہی تو وہ اس کو لے گئی تھی ـ

"آپکو پتہ ہے وہ اس وقت کہاں۔ کون سے ہاسپٹل میں ملینگی ـــــ؟

بڑھیا نے کچھ اچنبھے سے اشرف کو دیکھا جیسے اسکے صحیح الدماغ ہونے میں شک کر رہی ہو ـــــ پھر ہاتھ جھٹک کر بولی

"ارے صاب چنی کی بیماری اسکو بھی لگ گئی تھی اور اسی بیماری میں وہ چٹ پٹ بھی ہو گئی ـــــ میں خود ہسپتال گئی نہ اپنی چھوکریوں کو جانے دی ـــ ایک آدھ کو اور بھی یہ روگ لگ جاتا تو میری روزی کا کیا ہوتا ـــــ؟؟ کیا ہوتا بولو ـــــ؟"

اشرف اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا ـــ!

دل زندہ رکھ

مطالعہ غم او

جس انسان کو

سے گرا ہوا

دیوپا ٹی

حویلی حـ

صبح د

شام

شام